كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿ص : ٢٩﴾

تدبر قرآن

تفسیر سورۃ المدثر و سورہ المزمل

امین احسن اصلاحی

www.facebook.com/payamequran

پیامِ قرآن کی پیش کش

تدبرِ قرآن

تفسیر سورہ المزمل و سورہ المدثر

امین احسن اصلاحی

بسم الله الرحمن الرحيم

المزمل

(THE ENFOLDED ONE, THE ENSHROUDED ONE, BUNDLED UP)

20 آیات | مکیّ

سورہ کا زمانۂ نزول اور عمود

یہ سورہ اور بعد کی سورہ ۔۔۔المدّثّر۔۔۔دونوں بالکل ہم رنگ و ہم مزاج اور توام ہیں۔عام مفسرین نے ان کو بالکل ابتدائی سورتوں میں سے شمار کیا ہے لیکن ان کے مطالب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب قریش کے امراء و اغنیاء کی طرف سے دعوت کی مخالفت اتنی شدت اختیار کر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت حال سے نہایت مغموم و متفکر رہنے لگے ہیں۔

ایک انسان جب اپنے ماحول میں ہر شخص کی مخالفت اور اس کے طعن و طنز کا ہدف بن کر رہ جائے درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اس ماحول ہی کی اصلاح پر مامور ہو تو اس کے غم و الم کا جو حال ہو گا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔اس صورت حال سے قدرتاً اس پر خلوت پسندی اور خلق سے بے تکلفی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔وہ اٹھتا ہے تو اپنی چادر لپیٹ کر، چلتا ہے تو اس میں لپٹ کر، بیٹھتا ہے تو اس میں گوشہ گیر ہو کر اور لیٹتا ہے تو اس میں چھپ کر؛ اس لیے کہ تنہا اس کی چادر ہی ہوتی ہے جس کے دامن میں فی الجملہ اس کو اپنے باطن میں غوطہ زن ہونے اور اپنے خالق سے تعلق و توصل کے لیے سکون و اطمینان ملتا ہے۔

اس کا تھوڑا بہت تجربہ تو ہر اس شخص کو ہوتا ہے جو خلق و خالق سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کااحساس رکھنے والا ہو لیکن انبیاء علیہم السلام کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔وہ خلق کے لیے سراپا رحمت و شفقت اور اپنے رب کی ڈالی ہوئی ذمہ داریوں کے معاملے میں نہایت حساس ہوتے ہیں۔وہ اپنی جان توڑ مساعی و اصلاح کے باوجود جب دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی مخاصمت بڑھتی جا رہی ہے تو ان کو گمان گزرتا ہے کہ مبادا اس میں انہی کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔یہ چیز ان کے غم و فکر کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو مطعون کر کے اپنے دل کو تسلی دینے کے بجائے خود اپنے اندر خلوت گزیں ہو کر صورت حال کا صحیح ڈھونڈھنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس ذہنی کیفیت میں ان کو اپنی سب سے بڑی غم گسار اپنی چادر ہی محسوس ہوتی ہے جس میں چھپ کر گویا وہ اپنے ماحول سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

چادر میں لپیٹنے والے کو عربی میں "مزّمّل" کہتے ہیں۔اس لفظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کی اسی فکرمندی کا سراغ دیا ہے۔یہ نہایت پیار کا خطاب ہے۔اس دلنواز خطاب سے مخاطب کر کے آپ کو وہ طریقہ بتایا گیا ہے جو اس غم و الم کو دور کر کے آپ کے اندر وہ قوت و عزیمت پیدا کرے گا جو موجودہ اور آئندہ پیش آنے والے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے۔گویا اس سورہ میں حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے آپ کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی گئی ہے اور ساتھ ہی وہ نسخہ بھی بتایا گیا ہے جو حوصلہ کو بلند اور کمر ہمت کو مضبوط رکھنے کے لیے نہایت کیمیا اثر ہے۔

ب۔سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(1-14) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی تاکید کہ شب میں قیام لیل کا اہتمام کرو جس میں قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔اس سے دل کو ثبات اور دماغ کو بصیرت حاصل ہو گی جو آگے کی بھاری ذمہ داریوں کے اٹھانے کا اہل بنائے گی۔اسی طرح دن میں بھی تسبیح و تہلیل کے لیے بڑی گنجائش ہے، تو اپنے رب کے ذکر میں مطمئن اور اس کے دامن رحمت میں پناہ گیر رہو۔مشرق اور مغرب کا خداوند وہی ہے تو اپنا معاملہ اسی کے سپرد کرو۔تمہارے اعداء جو بکواس کر رہے ہیں اس کو صبر کے ساتھ نظر انداز کرو اور ان کا معاملہ ہم پر چھوڑو۔ہم ان سے نمٹنے کے لیے تنہا کافی ہیں۔

(15-19) قریش کے لیڈروں کو تہدید و وعید کہ جس طرح ہم نے اپنے دین کی گواہی دینے کے لیے فرعون کی طرف اپنا رسول بھیجا اسی طرح تمہاری طرف بھی ہم نے رسول بھیجا ہے تو رسول کی نافرمانی کا جو انجام فرعون اور اس کی قوم کے سامنے آیا اس انجام کو یاد رکھو۔اگر تم نے اسی کی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارا انجام اس سے مختلف ہو۔اس دن کو یاد رکھو جس کا ہول بچوں کو بوڑھا بنا دے گا اور جس کے بوجھ سے آسمان پھٹا پڑ رہا ہے۔اس سے آگاہ کرنے کے لیے ہم نے یہ یاددہانی اتاری ہے توجو سلامتی چاہے وہ اپنے رب کی راہ اختیار کر لے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہے۔

(20) آخر میں ایک مدنی آیت جس میں حالات کے تبدیل ہو جانے کے سبب سے اس حکم میں کسی قدر تخفیف کر دی گئی ہے، جو ابتدائی آیات میں دیا گیا ہے، اور اس کسر کے جبر کے لیے بعض ایسے بدل بتا دیے گئے جو اصل مقصد کی حفاظت کرنے والے اور بدلے ہوئے حالات کے مناسب ہیں۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿١﴾

اے چادر میں لپٹنے والے!

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت :

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسے لفظ سے مخاطب فرمایا گیا ہے جس سے آپ کی وہ تصویر سامنے آتی ہے جو اس اندرونی کیفیت کی غماز ہے جو سورہ کے زمانۂ نزول میں آپ پر بیشتر طاری رہتی تھی۔

'مُزّمّل' دراصل 'متزمل' ہے۔ عربیت کے قاعدے کے مطابق 'ت' حرف 'ز' میں مدغم ہو گئی ہے۔ اسی طرح کا تصرف لفظ 'مدّثّر' میں بھی ہوا ہے۔ اس کے معنی، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں، اپنے اوپر چادر لپیٹے رکھنے والے کے ہیں۔ یہ حالت بالعموم ایسے شخص کی ہوتی ہے جو سامنے کے حالات سے فکرمند اور گردوپیش کے لوگوں کے رویہ سے بددل ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ایک ایسے عذاب سے ڈرا رہے تھے جو ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا لیکن لوگوں کی بے گانگی و بے زاری کا یہ حال تھا کہ بات سننا تو درکنار الٹے منہ نوچنے کو دوڑتے اور آپ کی بے قراری و ہمدردی کو خبط و جنون قرار دیتے۔ ایسے حالات میں آپ کا متفکر و مغموم رہنا ایک امر فطری تھا اور فکر و غم کی حالت میں آدمی کی چادر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس کی بہترین غم

گسار ہوتی ہے۔ وہ اس میں لپٹ کر جب چاہتا ہے خلق سے منقطع اور خالق سے متصل ہو جاتا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ چادر اہل عرب کے لباس کا ایک نہایت اہم جزو بھی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ چادر رکھتے بھی تھے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثت سے پہلے بھی، جب آپ جستجوئے حقیقت میں سرگرداں تھے، آپ پر اسی طرح کی خلوت گزینی کی حالت طاری رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ سورۂ ضحیٰ میں اشارہ ہے، آپ کو راہ دکھائی۔ پھر یہی کیفیت آپ پر مزید شدت کے ساتھ اس وقت طاری ہوئی جب آپ کو اپنی مریض قوم کی دوابیزاری اور طبیب دشمنی کا ذاتی تجربہ ہوا۔ اس تجربہ سے آپ پر جو کیفیت طاری ہوئی لفظ 'مُزّمّل' اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ: بعض مفسرین نے اس خطاب سے یہ مطلب سمجھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے سوئے پڑے تھے کہ آپ کو وحی کے ذریعہ ہدایت ہوئی کہ اے چادر تان کر سونے والے اٹھ اور نماز پڑھ۔ یہ مطلب اگرچہ اس پہلو سے دلچسپ ہے کہ بعد کی آیات سے بظاہر اس کا جوڑ مل جاتا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات مبارک کے کسی دور میں بھی چادر تان کر غفلت کی نیند سونے والوں میں سے نہیں تھے۔ آپ ہمیشہ کھٹکے کی نیند سوتے اور دن کی طرح آپ کی شب بھی زیادہ تر ذکر و فکر ہی میں گزرتی۔ قرآن کی کسی آیت سے بھی یہ اشارہ نہیں نکلتا کہ آپ کو کبھی خدا سے غفلت کی بنا پر کوئی تنبیہ فرمائی گئی ہو بلکہ اس کے برعکس آپ کو بار بار اس بات پر نہایت پر محبت انداز میں عتاب ہوا ہے کہ آپ نے اپنے اوپر اس سے زیادہ بوجھ اٹھا رکھا ہے جتنا اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالا ہے۔ البتہ یہ بات قرآن میں جگہ جگہ ملتی ہے کہ دعوت کی راہ میں جب آپ کو مشکلات و مصائب سے سابقہ پڑا ہے اور آپ اس صورت حال سے فکرمند رہنے لگے ہیں تو آپ کے عزم و حوصلہ کو مضبوط اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے نماز بالخصوص تہجد کی نماز کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں بھی یہی صورت ہے۔

قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٢﴾ نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ﴿٣﴾ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ﴿٤﴾

رات میں قیام کر مگر تھوڑا حصہ۔ آدھی رات یا اس میں سے کچھ کم کر دے۔ یا اس پر کچھ زیادہ کر لے اور قرآن کی تلاوت کر ٹھہر ٹھہر کر۔

آیات کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

قیام لیل کی برقیام لیل کی برکتیں: لفظ 'مُزّمّل' میں حضورؐ کی جو فکر مندی اور پریشانی مضمر ہے یہ اس کا علاج بتایا جارہا ہے اور یہ علاج صرف یہیں نہیں بتایا گیا ہے بلکہ جب جب دعوت کی راہ میں آپ کو پریشانیاں پیش آئی ہیں ان کا یہی علاج آپ کو قرآن نے بتایا ہے اور ہم ہر جگہ اپنے علم کے حد تک اس کی حکمت کی وضاحت کر چکے ہیں۔ یہاں چونکہ اس علاج کی تاثیر اور اس کی قدر و قیمت آگے خود واضح فرمادی گئی ہے اس وجہ سے ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے صرف آیات کی تفسیر پر اکتفا کریں گے جس سے ان شاء اللہ خود یہ بات سامنے آجائے گی کہ مومن کے لیے اللہ تعالیٰ نے قیام لیل میں کیا برکتیں ودیعت فرمائی ہیں اور وہ کن پہلوؤں سے اس کی صرف شدہ قوتوں کو بحال اور اس کے عزم و ایمان کو مضاعف کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

قیام لیل کا وقت: 'قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۙ نِّصۡفَہٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡہُ قَلِیۡلًا ۙ اَوۡ زِدۡ عَلَیۡہِ'۔ رات سے یہاں ظاہر ہے کہ رات کا نصف آخر ہے، جب آدمی کچھ سو چکنے کے بعد اٹھتا ہے۔ اس کی وضاحت آگے 'نَاشِئَۃَ الَّیۡلِ' کے لفظ سے ہو گئی ہے۔ تہجد کے لیے یہی وقت نبی ﷺ کے عمل سے بھی ثابت ہے اور یہی اصل مقصد کے اعتبار سے سب سے زیادہ بابرکت بھی ہے۔ یہ وقت رات کے نصف کے بقدر بھی ہو سکتا ہے، اس سے کچھ کم بھی ہو سکتا ہے اور اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ شب کے پچھلے پہر میں اٹھنا ایک کٹھن کام ہے، اس میں دیر سویر کے ہو جانے کا امکان ہے، اس وجہ سے وقت کے معاملے میں وسعت رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ مشقت کو موجب نہ ہو۔ اگرچہ الفاظ قرآن سے پوری نصف شب کے قیام کا اولیٰ ہونا نکلتا ہے لیکن کمی بیشی کی گنجائش الفاظ میں موجود ہے۔

قرآن کی تلاوت کا طریقہ: 'وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا' یہ قرآن کے پڑھنے کا طریقہ بتایا گیا کہ نماز میں اس کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ قرآن لحن اور لے سے پڑھتے، آیت آیت پر وقف فرماتے، کبھی کبھی ایک ہی آیت شدت تاثر میں بار بار دہراتے علاوہ ازیں کوئی آیت قہر و غضب کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے غضب سے پناہ مانگتے اور جو آیت رحمت کی ہوتی اس پر ادائے شکر فرماتے۔ بعض آیتیں جن میں سجدہ کا حکم یا اشارہ ہے ان کی تلاوت کے وقت، فوری امتثال امر کے طور پر آپ سجدہ میں بھی گر جاتے۔

تلاوت قرآن کا یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق بھی ہے اور یہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور و منقول بھی ہے۔ قرآن کے مقصد نزول کے پہلو سے بھی یہی طریقہ نافع ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں میں یہ طریقہ صرف اس وقت تک باقی رہا جب تک وہ قرآن کو فکر و تدبر کی چیز اور زندگی کی رہنما کتاب سمجھتے رہے۔ بعد میں جب قرآن صرف حصول ثواب اور ایصال ثواب کی چیز بن کے رہ گیا تو یہ اس طرح پڑھا جانے لگا جس کا مظاہرہ ہمارے حفاظ کرام تراویح اور شبینوں میں کرتے ہیں۔

اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ﴿۵﴾

ہم تم پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

"قولِ ثقیل" سے مراد: یہ اس مقصد عظیم کی طرف اشارہ ہے جس کے لئے قیام لیل کی یہ ہدایت فرمائی گئی۔ ارشاد ہے کہ ہم عنقریب تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس بھاری بات کے تحمل کے لئے ایک پیشگی ریاضت اور تیاری کے طور پر آپ کو اس کا حکم ہوا۔ اس بھاری بات سے کیا مراد ہے؟ اس کے جواب میں اہل تاویل سے مختلف اقوال منقول ہیں لیکن ان کی بنیاد کسی دلیل پر نہیں ہے اس وجہ سے ان کے نقل کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ اس سے اس انذار عام کو مراد لیتے ہیں جس کا حکم اگلی سورہ میں "یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ قُمْ فَاَنْذِرْ — المدثر: ۱-۲- اے چادر میں لپٹنے والے، اٹھ اور انذار کر۔ اور اس کے بعد کی آیات میں دیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی رائے قرین قیاس ہے۔ اس لئے کہ اسی انذار عام سے بعد میں براءت، ہجرت اور اعلان جنگ کے وہ مراحل سامنے آئے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک کے شدید ترین مراحل ہیں، جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ بھی ایسے کڑے امتحانوں سے گزرے کہ ان کے تصور سے بھی کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد کی امتیازی خصوصیات: اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو قیام لیل کا حکم اس جہاد عظیم کی تیاری کے لئے دیا گیا جس سے آگے آپ ﷺ کو اور آپ کے صحابہ کو اقامت دین کی راہ میں سابقہ پیش آنے والا تھا۔ اقامت دین کی جدوجہد کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اس کو دوسری تمام تحریکات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کے لئے دوسرے وسائل وذرائع کے فراہم ہونے سے پہلے صحیح معرفت رب، مستحکم ایمان، غیر متزلزل صبر اور اپنے رب پر کامل اعتماد و توکل ضروری ہے۔ ان اوصاف کے حصول کا واحد ذریعہ نماز بالخصوص شب کی نماز ہے بشرطیکہ وہ اس طرح ادا کی جائے جس طرح اس کے ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی چٹان پر اقامت دین کی جدوجہد کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کے بغیر اگر دین کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ کھڑی ہونے سے پہلے ہی زمین بوس ہو جائے گی۔

إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ﴿٦﴾

بے شک رات میں اٹھنا دل جمعی اور فہم کلام کے لیے نہایت خوب ہے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

قیام لیل کی حکمت: یہ اللہ تعالیٰ نے حکمت بتائی ہے اس بات کی کہ آپ کو قیام لیل کا یہ حکم کیوں دیا گیا۔ فرمایا کہ اس لیے کہ یہ وقت سکون قلب و دماغ کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور فہم قرآن کے لیے سب سے زیادہ ساز گار و مدد گار ہے۔

'نَاشِئَةٌ' ہمارے نزدیک 'نشأ' سے، جس کے معنی اٹھنے کے ہیں 'عَاقِبَةٌ' اور 'عَافِيَةٌ' کے وزن پر مصدر یا حاصل مصدر ہے۔ 'نَاشِئَةَ الَّيْلِ' کے معنی ہوں گے قیام لیل یا شب خیزی۔ اس لفظ ہی سے یہ بات نکلی کہ تہجد کا وقت در حقیقت شب میں کچھ سو کر اٹھنے کے بعد یعنی پچھلے پہر کا ہے۔ اس وقت اٹھنا اگرچہ اس اعتبار سے ایک مشکل کام ہے کہ اس وقت کی نیند بہت محبوب ہوتی ہے لیکن اس امتحان میں انسان اگر کامیاب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی کتاب کے سمجھنے کے لیے اس سے زیادہ بابرکت وقت اور کوئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو اس ساعت میمون میں بستر سے اٹھنے کی توفیق دیتا ہے اول تو اس کو اپنے نفس کی خواہشوں پر غلبہ پانے کی ایسی قوت حاصل ہو جاتی ہے جو اس کے لیے اصلاح نفس کی راہ میں فتوحات کے بے شمار دروازے کھول دیتی ہے ثانیاً اللہ تعالیٰ نے، جو رات اور دن کو وجود میں لانے والا ہے، اس وقت کو اپنی رحمتوں کے نزول کے لیے مخصوص فرمایا ہے جن کے دروازے اس کے ان بندوں کے لیے کھلتے ہیں جو اس کی قدر و قیمت پہچانتے اور اس وقت اس کے دروازے پر سائل بن کر حاضر ہوتے ہیں۔

شب خیزی کی تاثیر: 'اَشَدُّ وَطْأً' یہ اس وقت اٹھنے کی تاثیر بتائی ہے کہ جب آدمی اس وقت بستر سے اٹھ کر، وضو کر کے، نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اس کے قدم خوب جمتے ہیں۔ قدم خوب جمنا دماغ کی یکسوئی، دل کے اطمینان اور عقل کی بیداری کی تعبیر ہے۔ اگر دماغ پریشان اور قلب بے سکون ہو تو آدمی کے قدم نہیں جمتے، کوئی بڑا کام تو درکنار وہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی دلجمعی سے نہیں کر سکتا۔ گویا یہاں ظاہر سے ان کے باطن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ اس وقت اٹھنا نفس کو اچھی طرح کچلنے والا ہے۔ اگرچہ الفاظ میں اس معنی کی بھی گنجائش ہے لیکن آگے کے فقرے سے اسے مناسبت نہیں ہے۔ میں نے جو معنی اختیار کیے ہیں وہ دوسرے مفسرین نے بھی لیے ہیں لیکن انھوں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ نہیں کیا کہ ثبات قدم در حقیقت قلبی و عقلی یکسوئی و دلجمعی کی تعبیر ہے۔

'وَّاَقۡوَمُ قِیۡلًا' یعنی یہ وقت چونکہ دماغ کے سکون اور دل کی بیداری کا خاص وقت ہے اس وجہ سے زبان سے جو بات نکلتی ہے تیر بہدف اور 'از دل خیزد بر دل ریزد' کا مصداق بن کر نکلتی ہے۔ آدمی خود بھی اس کو اپنے دل کی گواہی کی طرح قبول کرتا ہے اور دوسرے سننے والوں کے دلوں پر بھی اس کی تاثیر بے خطا ہوتی ہے۔ جنات کا جو واقعہ سورۂ جن میں بیان ہوا ہے روایات اور قرائن دونوں سے ثابت ہے کہ انھوں نے تہجد ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے سنا اور اس درجہ متاثر ہوئے کہ نہ صرف اس پر ایمان لائے بلکہ اپنی قوم کے اندر اس کے داعی بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے عظیم انسان کے دل کو بھی اسی طرح کے ایک واقعہ نے فتح کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تہجد میں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق تلاوت قرآن صرف اپنے ہی نفس کے تہذیب و تزکیہ کے لیے نہیں بلکہ بعض اوقات دوسروں کے ارواح و قلوب کو زندہ کر دینے کے لیے بھی ندائے غیب کی حیثیت رکھتی ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے۔

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ﴿٧﴾

دن میں بھی تمہارے لیے کافی تسبیح کا موقع ہے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

'سبحِ طویل' کی تاویل: عام طور پر لوگوں نے اس کے معنی یہ لیے ہیں کہ دن میں تمہارے لیے اور بھی بہت سے کام ہیں یعنی دن میں چونکہ دوسرے بہت سے دھندے گھیرے رہتے ہیں، نماز کے لیے دلجمعی کا وقت مشکل ہی سے میسر آتا ہے، اس وجہ سے شب میں تم کو تہجد کے اہتمام کا حکم دیا گیا۔

لفظ 'سبح' کے اندر، از روئے لغت، اس معنی کی گنجائش موجود ہے لیکن ہمارا دل مختلف وجوہ سے اس تاویل پر نہیں جمتا۔

اول وجہ یہ ہے کہ قیام لیل کے لیے پچھلے پہر کا وقت اللہ تعالیٰ نے صرف اس وجہ سے نہیں منتخب فرمایا ہے کہ دن میں آدمی کے سامنے دوسری بہت سی مشغولیتیں ہیں بلکہ قرآن کے متعدد اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں اپنے مزاج و کیفیات کے اعتبار سے یہی وقت ان مقاصد کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے جو قیام شب سے مقصود ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر یہ بات کہنی ہوتی تو اس کے لیے سادہ اسلوب بیان یہ ہوتا کہ 'اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ شُغْلًا كَثِيْرًا' یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ ہوتے۔ لفظ 'سبح' تیرنے، چلنے وغیرہ کے معنی میں آتا ہے لیکن شغل اور مصروفیت کے معنی میں یہ ایسا معروف نہیں ہے کہ بغیر واضح قرینہ کے ذہن اس کی طرف منتقل ہو سکے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر لفظ 'سبح' یہاں اس معنی میں ہوتا تو اس کی صفت 'طَوِيْلًا' کی جگہ 'كَثِيْرًا' یا 'كَبِيْرًا' زیادہ موزوں ہوتی۔

ان مختلف وجوہ سے اس تاویل پر دل پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ ہمارے نزدیک لفظ 'تسبیح' یہاں اپنے معروف معنی یعنی تسبیح کرنے ہی کے معنی میں ہے اور آیت کی تاویل یہ ہے کہ شب میں تمھیں جس اہتمام نماز کا حکم دیا جا رہا ہے اس کے علاوہ دن میں بھی تمہارے لیے کافی تسبیح کا موقع ہے جس کا اہتمام رکھو۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ حضورؐ دن میں بھی اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور سوتے جاگتے اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے آپ سے دعائیں منقول ہیں۔ آدمی ان کا اہتمام رکھے تو اس کا کوئی قدم بھی ذکر کے بغیر نہیں اٹھ سکتا اور ان کی برکت سے آدمی کے وہ کام بھی عبادت بن جاتے ہیں جو بظاہر دنیا کے کام خیال کیے جاتے ہیں۔

دین میں مطلوب ذکر دوام ہے: یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ دین میں مطلوب ذکر دوام ہے۔ اس مسئلہ پر اس کے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔ جس طرح انسان کی مادی زندگی کے لیے سانس ضروری ہے اسی طرح اس کی روحانی زندگی کے لیے اللہ کی یاد ضروری ہے۔ سانس رک جائے تو جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ سے غفلت ہو جائے تو روح پژمردہ ہو جاتی ہے۔ دل ذکر کی جھڑی ہی سے زندہ رہتا ہے اور دل کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔

آیات آفاق و انفس میں تفکر بھی ذکر ہے: یہاں وہ حقیقت بھی پیش نظر رہے جو اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں بیان ہو چکی ہے کہ اللہ کے دین کی دعوت اور آیات آفاق و انفس میں تدبر و تفکر بھی ذکر ہی میں شامل ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ اس کو افضل الذکر کی حیثیت حاصل ہے اس لیے کہ اس تفکر ہی سے در حقیقت ذکر کے اندر حقیقی معنویت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ذکر محض ورزش زبان بن کے رہ جاتا ہے۔ زندگی پر اس کا کوئی مفید اثر مرتب نہیں ہوتا۔ اس مسئلہ پر 'الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ' آل عمران (3:191) کے تحت بحث گزر چکی ہے۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ﴿٨﴾

اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور اس کی طرف گوشہ گیر ہو جا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

رب کے دامن رحمت میں پناہ گیر ہونے کا طریقہ: 'تَبَتُّلٌ' اور 'تَبْتِيلٌ' دونوں کے معنی انقطاع الی اللہ کے ہیں یعنی خلق سے کٹ کر رب کے دامن رحمت میں پناہ گیر ہو جانا۔ یہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو طریقہ بتایا اس بات کا کہ جب جب لوگوں کی حق بیزاری اور دل آزاری سے دل آزردہ ہو تو تم ان ناقدروں سے کٹ کر اپنے رب کے دامن رحمت میں پناہ گیر ہو جایا کرو اور اس کے لیے تمہیں اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے کہ تم اس کے نام کو یاد کرو۔ جب تم اس کے نام کے ساتھ اس کو یاد کرو گے تو وہ خود تمہیں اپنی پناہ میں لے لے گا۔

صفات الٰہی کا استحضار: یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام اس کی صفات کی تعبیر ہیں اور ان کی صفات ہی پر تمام دین و شریعت اور سارے ایمان و عقیدہ کی بنیاد ہے۔ ان صفات کا صحیح علم مستحضر رہے تو آدمی کی پشت پر ایک ایسا لشکر گراں اس کے محافظ کی حیثیت سے موجود رہتا ہے کہ شیطان کی ساری فوجیں اس کی نگاہوں میں پر کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ وہ اپنے آپ کو پہاڑوں سے بھی زیادہ مستحکم محسوس کرتا ہے۔ اور اگر خدا کی صفات کی صحیح یادداشت اس کے اندر باقی نہ رہے یا کمزور ہو جائے تو پھر اس کا عقیدہ بے بنیاد یا کمزور ہو جاتا ہے جس کے سبب سے اس کو منافقین کی طرح ہر بجلی اپنے ہی خرمن پر گرتی نظر آتی ہے۔

رَّبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ﴿٩﴾

وہی مشرق و مغرب کا خداوند ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز بنا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یعنی اللہ کی پناہ کسی کمزور کی پناہ نہیں ہے بلکہ تمام مشرق و مغرب کے خداوند کی پناہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جو اس کا شریک و سہیم ہو یا اس کے ارادوں میں مزاحم ہو سکے۔ اس کو وکیل بناؤ گے تو وہ تمہارے لیے کافی ہے۔ 'وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا' (النسآء 4:81)

وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا ﴿۱۰﴾

اور یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کر اور ان کو خوبصورتی سے نظر انداز کر۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

مخالفین کی باتوں پر صبر اور اس صبر کا طریقہ: اپنے جھٹلانے والوں کی بے ہودہ گوئیوں پر صبر کرو اور اپنے موقف پر ڈٹے رہو نہ ان کی باتوں کا غم کرو اور نہ زیادہ ان کے درپے ہو، بلکہ ان کو خوبصورتی کے ساتھ چھوڑو۔ وہ اپنی اس روش کا خمیازہ خود بھگتیں گے۔

چھوڑنا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک چھوڑنا تو وہ ہے جو فضیحتا اور لعن طعن کے بعد، عناد و انتقام کے جذبہ کے ساتھ ہو۔ اس طرح کا چھوڑنا عام دنیا داروں کا شیوہ ہے۔ اخیار و صالحین یہ طریقہ نہیں اختیار کرتے۔ وہ خلق کی اصلاح کی کوشش اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی ہدایت اور اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔ لوگ ان کی ناقدری اور دل آزاری کرتے ہیں تو انھیں غصہ یا نفرت کے بجائے ان کے حال پر افسوس اور ان کی محرومی و بدانجامی پر صدمہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں وہ ان کے رویہ سے مجبور ہو کر ان کو چھوڑتے تو ہیں لیکن یہ چھوڑنا اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح ایک شریف باپ اپنے نالائق بیٹے کے رویہ پر خاموشی اور علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح کے چھوڑنے کو یہاں 'ہجر جمیل' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس طرح کی علیحدگی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہے۔ جن کے اندر خیر کو کوئی رمق ہوتی ہے وہ اس شریفانہ طرزِ عمل سے متاثر اور اپنے رویہ کا جائزہ لینے کی طرف مائل ہوتے ہیں ورنہ کم سے کم انھیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ شخص ان کے باطل پر راضی ہونے والا نہیں ہے خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ جب تک پیغمبر اپنی قوم کے اندر رہتا ہے قوم کی زیادتیوں کا مقابلہ وہ اسی 'ہجر جمیل' سے کرتا ہے۔ البتہ جب قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو وہ اس کو اعلان براءت کے ساتھ چھوڑتا ہے اور اس کا یہ چھوڑنا قوم کی موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ﴿١١﴾

اور ان اہل تنعم جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ اور ان کو کچھ دیر اور مہلت دے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

تکذیب کرنے والوں کو سخت دھمکی: یہ پیغمبر ﷺ کو خطاب کر کے جھٹلانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے نہایت سخت دھمکی دی ہے کہ تم ان کا معاملہ مجھ پر چھوڑو اور تھوڑی سی مہلت ان کو اور دو۔ مطلب یہ ہے کہ پھر دیکھو کہ ان کا حشر کیا ہوتا ہے!

'وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ' کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ تم الگ ہو کر بیٹھو اور مجھے تنہا ان سرکشوں سے نمٹ لینے دو، تمہارے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں ہو گی۔

اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ان جھٹلانے والوں کی تباہی میں کچھ دیر ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ان کے اندر تم موجود ہو۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ جب تک پیغمبر قوم کے اندر موجود رہتا ہے اس وقت تک قوم پر عذاب نہیں آتا۔ تم چھوڑو تو چشم زدن میں ان سرکشوں کا تیا پانچا ہوا جاتا ہے۔ یہ ان ظالموں کی بد بختی ہے کہ وہ تمہارے درپے آزار ہیں۔ ان کے لیے عذاب کے مقابل میں امان کی دیوار تمہی ہو۔ اگر اس امان سے انھوں نے اپنے کو محروم کر لیا تو عذاب سے ان کو کون بچائے گا۔

'أُولِي النَّعْمَةِ' کے معنی ارباب تنعم و رفاہیت کے ہیں۔ لفظ 'نَعْمَةٌ' رفاہیت و تنعم کے معنی میں آتا ہے۔ 'مُكَذِّبِيْنَ' کی اس صفت کے حوالہ سے مقصود ان کے سبب تکذیب کا سراغ دینا اور ان کی ناشکری پر ان کو ملامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تنعم و رفاہیت سے بہرہ مند فرمایا تھا تو اس کا حق یہ تھا کہ اپنے رب کے شکر گزار رہتے لیکن اللہ کی بخشی ہوئی خوشحالی ان کے لیے استکبار کا سبب ہوئی اور وہ اپنے رب کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا ﴿١٢﴾

ہمارے پاس ان کے لیے بیڑیاں اور دوزخ کی آگ ہے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یعنی جب ہماری بخشی ہوئی رفاہیت اس دنیا میں ان کے لیے استکبار اور رسول کی تکذیب کا سبب ہوئی تو یاد رکھیں کہ ان کے لیے ہمارے پاس آخرت میں بیڑیاں اور جہنم ہے۔ یعنی بیڑیوں اور زنجیروں کے اندر جکڑ کر جہنم کے اندر جھونک دیے جائیں گے۔ 'اَنْکَالٌ' جمع ہے 'نِکْلٌ' کی۔ اس کے معنی بیڑی کے بھی ہیں اور آہنی لگام کے بھی۔ دوسرے مقام میں 'سَلَاسِلُ' اور 'اَغْلَالٌ' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣﴾

اور حلق میں پھنسنے والا کھانا اور نہایت دردناک عذاب۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

'وَطَعَاماً ذَا غُصَّةٍ وَعَذَاباً أَلِيماً'۔ یعنی ہم نے ان کو جو تر نوالے بخشے انھوں نے ان کا حق نہیں پہچانا تو یاد رکھیں کہ آخرت میں ان کو وہ کھانا ملے گا جو ان کے حلق میں پھنس کر رہ جائے گا اور اس عیش کی جگہ ان کو ایک دردناک عذاب سے سابقہ پیش آئے گا۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ﴿١٤﴾

اس دن جس دن زمین اور پہاڑ لرز اٹھیں گے اور پہاڑ بھر بھرے ٹیلے بن جائیں گے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یہ اس دن کی یاددہانی ہے جس دن ان مغروروں کو مذکورہ حالات سے سابقہ پیش آئے گا۔ فرمایا کہ اس دن یہ زمین اور پہاڑ سب لرز اٹھیں گے اور امراء کے ایوان و محل تو درکنار پہاڑوں کا بھی یہ حال ہو گا کہ وہ بھر بھرے ریت کے تودوں کے مانند ہو جائیں گے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿١٥﴾ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ﴿١٦﴾

ہم نے تم لوگوں کی طرف ایک رسول بھیجا ہے تم پر گواہ بنا کر جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔ تو فرعون نے رسول کی نافرمانی کی، پس ہم نے اس کو پکڑا نہایت سخت پکڑنا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

قریش کو تنبیہ: آنحضرت ﷺ کو ضروری ہدایات دینے کے بعد اب یہ قریش کو تنبیہ فرمائی جا رہی ہے کہ جس طرح ہم نے فرعون کی طرف اپنا ایک رسول بھیجا تھا اسی طرح تمہاری طرف بھی ایک رسول بھیج دیا ہے تا کہ وہ ہمارے خاص شاہد کی حیثیت سے تمہیں بتادے کہ ہماری پسند اور ہمارے احکام کیا ہیں اور تم نے ان کو قبول کیا تو دنیا اور آخرت میں اس کا کیا صلہ ملے گا اور اگر اس کی نافرمانی کی تو اس کا انجام کیا ہو گا مطلب یہ ہے کہ تم جس شخص کی تکذیب و توہین کر رہے ہو اس کے مرتبہ اور اس کی حیثیت کو اچھی طرح جان اور سمجھ لو کہ اس کی تکذیب کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔ وہ کوئی سائل یا محض واعظ نہیں ہے جس کے رد و قبول کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو بلکہ اللہ نے اس کو تمہارے اوپر حق کی گواہی دینے کے لیے بھیجا ہے اس وجہ سے اس کے ذریعہ سے لازماً حق و باطل کے درمیان فیصلہ ہونے والا ہے اور یہ فیصلہ اسی طرح ہو گا جس طرح موسیٰ اور فرعون کے درمیان ہوا۔ جس طرح فرعون نے رسول کی نافرمانی کی تو اللہ نے اس کو پکڑا اور اس طرح پکڑا کہ اس کو کوئی پناہ نہ مل سکی اسی طرح تمہیں بھی وہ اس طرح پکڑے گا کہ کوئی اس کے پنجہ سے تمہیں چھڑا نہ سکے گا۔

'شَاهِدًا عَلَيْكُمْ' کے مفہوم کی پوری وضاحت ہم 'لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا' (البقرہ 143:2) کے تحت کر چکے ہیں۔

فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ﴿١٧﴾

تو اگر تم نے بھی کفر کیا تو اس دن کے عذاب سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا!

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یعنی ابھی پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو یہ نہ سمجھو کہ کبھی نہیں ہو گی۔ اس دنیا میں نہ بھی ہوئی تو آخرت تو بہر حال شدنی ہے تو سوچ لو کہ اگر تم نے رسول کا انکار کیا تو اس دن کے ہول سے کس طرح بچو گے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا! 'بچوں کو بوڑھا بنا دے گا' کسی ہول کی شدت اور بے پناہی کی تعبیر ہے۔ ہماری زبان میں بھی بولتے ہیں کہ فلاں صدمہ نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ روایات میں بھی آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ 'شیبتنی ھود واخواتھا' مجھے سورۂ ہود اور اس کی ہم جنس سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ عرب شعراء نے بھی مختلف اسلوبوں سے یہ محاورہ استعمال کیا ہے۔ یہ معروف ہے اس وجہ سے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صاحب کشاف نے بعض شواہد کا حوالہ دیا ہے جو قابل اعتماد ہیں۔

السَّمَآءُ مُنۡفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ كَانَ وَعۡدُهٗ مَفۡعُوۡلًا ﴿۱۸﴾

آسمان اس کے بوجھ سے پھٹا پڑ رہا ہے اور اللہ کا وعدہ شدنی ہے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یعنی روز قیامت کو کوئی اَن ہونی بات نہ خیال کرو۔ آسمان اس کے بوجھ سے پھٹا پڑ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پھٹ پڑے اور قیامت اس کے اندر سے نمودار ہو جائے اور تم اسی طرح اس سے غفلت ہی میں رہو۔ یہی مضمون سورۂ اعراف میں اس طرح بیان ہوا ہے:

ثَقُلَتۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ لَا تَاۡتِیۡکُمۡ اِلَّا بَغۡتَۃً. (الاعراف 187:7)

آسمان و زمین دونوں اس کے حمل سے بوجھل ہیں، وہ تمہارے اوپر اچانک ہی آ دھمکے گی۔

یعنی آخرت کوئی محتاج ثبوت چیز نہیں ہے، اس کے ظہور کا وقت اگرچہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہے لیکن اس کے شواہد آسمان و زمین میں اس طرح نمایاں ہیں جس طرح آخری دنوں میں حاملہ کا حمل ہوتا ہے۔ اس کے جننے کا صحیح وقت کوئی نہیں بتا سکتا لیکن ہر آنکھ رکھنے والا جانتا ہے کہ وہ جنے گی۔ اسی طرح قیامت کے آثار نمایاں ہیں اور آسمان اس کے بوجھ سے اس طرح پھٹا پڑ رہا ہے کہ ہر لمحہ اس کا ظہور متوقع ہے۔ بد قسمت ہیں وہ لوگ جو صرف اس بنا پر اس سے نچنت ہیں کو ان کو اس کا صحیح وقت نہیں بتایا گیا۔

اِنَّ هٰذِهٖ تَذۡكِرَةٌ ۚ فَمَنۡ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيۡلًا ﴿۱۹﴾

یہ ایک یاددہانی ہے تو جو چاہے وہ اپنے رب کی راہ اختیار کر لے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

’هٰذِهٖ‘ سے اشارہ قرآن کی ان آیات کی طرف ہے جو قریش کو آخرت کی تذکیر کے لیے سنائی گئیں۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب سے پہلے تذکیر و تنبیہ ضروری تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بھیج کر حجت تمام کر دی۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے جس کا جی چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کر کے اس کی رحمت و رضوان کا مستحق بن جائے اور جس کا چاہے وہ اپنی گمراہی پر اڑا رہے اور اس کا انجام دیکھے۔ اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ ۙ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ ۙ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۚ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا وَأَعْظَمَ أَجْرًا ۚ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٠﴾

بے شک تمہارا رب جانتا ہے کہ تم شب میں دو تہائی رات کے قریب یا نصف یا تہائی رات قیام کرتے ہو اور ایک گروہ تمہارے ساتھیوں میں سے بھی۔ اور اللہ ہی رات اور دن کا اندازہ ٹھہراتا ہے۔ اس نے جانا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے تو اس نے تم پر عنایت کی نظر کی تو قرآن میں سے جتنا میسر ہو سکے پڑھ لیا کرو۔ اس کے علم میں ہے کہ تم میں مریض بھی ہوں گے اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کے فضل کی طلب میں سفر کریں گے اور دوسرے ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھیں گے تو جتنا میسر ہو سکے اس میں سے پڑھ لیا کرو اور نماز کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرض دو قرض اچھا اور جو کچھ بھی تم اپنے لیے پہلے سے بھیج رکھو گے اس کو اللہ کے پاس اس سے بہتر اور اجر میں برتر پاؤ گے۔ اور اللہ سے استغفار کرتے رہو۔ بے شک اللہ بڑا ہی غفور رّحیم ہے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

ابتدائے سورہ کے بعض احکام سے متعلق وضاحت: یہ اس سورہ کی آخری آیت ہے۔ اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی لیکن اس کا تعلق اسی حکم سے ہے جو ابتدائے سورہ میں نبی ﷺ کو، قیام لیل سے متعلق، دیا گیا ہے اس وجہ سے جگہ اس کو اسی سورہ کے اخیر میں ملی تاکہ اس باب کے سابق اور لاحق دونوں حکموں کی نوعیت اور ان کا باہمی تعلق سمجھنے میں مدد ملے۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں اور یہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ سورتوں میں آیات کی ترتیب ان کی معنوی مناسبت سے ہے اور یہ کام اللہ تعالیٰ کے حکم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے تحت ہوا ہے۔

'اِنَّ رَبَّكَ يَعۡلَمُ اَنَّكَ تَقُوۡمُ اَدۡنٰى مِنۡ ثُلُثَىِ الَّيۡلِ وَنِصۡفَهٗ وَثُلُثَهٗ'۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحسین فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خوب علم ہے کہ تمہیں شب میں قیام کا جو حکم دیا گیا تم پورے اہتمام کے ساتھ اس کی پابندی کر رہے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری یہ سرگرمیاں اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور جب اس کے علم میں ہیں تو یہ رائگاں جانے والی نہیں ہیں بلکہ ان کا بھرپور صلہ پاؤ گے۔

'وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيۡنَ مَعَكَ' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحسین کے بعد یہ ان مسلمانوں کی تحسین ہے جنھوں نے آپ کے اتباع کے شوق میں ازخود اس حکم کی پابندی اپنے اوپر لازم کر لی۔ یہ حکم تھا تو، جیسا کہ الفاظ سے واضح ہے، خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے لیکن صحابہؓ ہر اس کام کے لیے سبقت کرتے جس پر حضور ﷺ کو کاربند دیکھتے۔ اگرچہ ایمان بالرسولؐ کا حقیقی تقاضا یہی ہے کہ رسول کے ہر نقش قدم کی پیروی کی جائے لیکن رسول کی قوت برداشت اور دوسروں کی قوت برداشت میں بڑا فرق ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کے لیے اس حکم کی نوعیت میں تبدیلی کر دی، جس کی وضاحت آگے کے ٹکڑے میں آ رہی ہے، تاکہ ان کے لیے یہ بوجھ ان کی قوت برداشت سے زیادہ نہ ہو جائے۔

عام مسلمانوں کے لیے تخفیف: 'وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ اَنۡ لَّنۡ تُحۡصُوۡهُ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ'۔ فرمایا کہ رات اور دن کو مقدر کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے تقاضے اور مطالبے کیا ہیں، زندگی پر کن کن پہلوؤں سے یہ اثر انداز ہوتے ہیں، انسان ان میں سے کس کا کس حد تک محتاج ہے اور اس کو کن حالات و مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اپنے اس علم کی روشنی میں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نصف شب یا ثلث یا دو ثلث شب کے قیام کی پابندی کا اہتمام نہ کر سکو گے تو جتنا بھی ممکن ہو سکے اتنا قرآن پڑھ لیا کرو۔

'فَتَابَ عَلَيْكُمْ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ 'تاب' کا صلہ جب 'عَلٰی' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی عنایت کی نظر کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

'فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ' کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن یہ بات قیام لیل کے سلسلہ میں فرمائی گئی ہے اس وجہ سے مدعا تہجد ہی میں قرآن پڑھنا ہے۔ اگرچہ تلاوت قرآن بجائے خود بھی عبادت ہے لیکن تہجد میں، ترتیل کے ساتھ، اس کی تلاوت ہی سے وہ برکتیں ظہور میں آتی ہیں جن کے لیے نبی ﷺ کو اس اہتمام کے ساتھ اس سورہ میں اس کا حکم دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تخفیف درحقیقت عام مسلمانوں کے لیے اس بنا پر ہوئی کہ وہ اس بھاری بوجھ کو نہیں اٹھا سکتے تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بدستور اسی اصل حکم پر آخری لمحات حیات تک قائم رہے جو آپ کو دیا گیا۔ عام اہل ایمان کے لیے ایک فضیلت کے درجے میں یہ باقی ہے اور یہ بات ہر ایک کے شوق اور حوصلہ پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ اس میں کتنا حصہ لیتا ہے۔

'عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ'۔

تخفیف کے وجوہ: یہ ان امکانات کی طرف اشارہ ہے جو پیش آسکتے ہیں اور جو اس تخفیف کے متقاضی ہوئے۔ فرمایا کہ تم میں مریض بھی ہوں گے، مختلف دینی و دنیاوی ضروریات کے لیے سفر کرنے والے بھی ہوں گے، اللہ کی راہ میں تمہیں جنگ کے لیے بھی اٹھنا ہوگا اس وجہ سے اس سعادت میں حصہ لینے کے لیے یہ کافی ہے کہ تم جتنا وقت بھی پا جاؤ اور جتنا قرآن بھی پڑھ سکو پڑھ لیا کرو۔

'يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ' سے مراد ہو وہ سفر ہے جو کسی نیک اور اعلیٰ مقصد سے ہو، عام اس سے کہ وہ طلب علم کے لیے ہو یا حج کے لیے یا تجارت کے لیے۔ تجارتی سفر کے لیے یہ الفاظ قرآن میں جگہ جگہ آئے ہیں۔

'وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا'۔ یہ اس کسر کے جبر کی تدبیر بتائی ہے کہ اگر قیام شب کی برکتوں میں تم پورا پورا حصہ نہیں لے سکتے تو اپنے امکان کے حد تک پنج وقتہ نمازوں کا اہتمام رکھو، زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کے کلمہ کو بلند اور دین و ملت کی ہنگامی ضروریات میں فراخ دلی سے خرچ کرتے رہو۔ اس طرح تم اپنے رب کا قرب اور اس کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہو۔

’وَاَقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا‘ سے یوں تو ہر وہ انفاق مراد ہو سکتا ہے جو اللہ کی راہ میں فراخ دلی سے کیا جائے لیکن جب اس کا ذکر ایتائے زکوٰۃ کے ساتھ ہو تو اس سے خاص طور پر وہ انفاق مراد ہوتا ہے جو جنگ و جہاد یا کسی اہم ہنگامی ضرورت کے لیے کیا جائے۔

’وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِكُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ تَجِدُوۡهُ عِنۡدَ اللّٰهِ هُوَ خَيۡرًا وَّاَعۡظَمَ اَجۡرًا‘۔ یہ انفاق کے لیے ترغیب و تشویق ہے کہ اللہ کی راہ میں جو خرچ کرو گے وہ کسی دوسرے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ہی لیے کرو گے۔ وہ خدا کے ہاں تمہارے ہی کھاتے میں جمع ہوگا اور اس کو نہایت بہتر اور نافع تر شکل میں اپنے رب کے ہاں پاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں بلکہ سب سے زیادہ نفع بخش تجارت ہے۔

’وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ‘۔ یعنی اس اہتمام کے علاوہ جو مذکور ہوا، برابر اپنے رب سے اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کی معافی بھی مانگتے رہو اور یہ امید رکھو کہ وہ معاف فرمائے گا۔ وہ بڑا ہی غفور رّحیم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وہ غلطیوں سے درگزر فرمائے اور اس کی صحیح باتوں کے لیے دل میں جگہ پیدا کرے۔ **واللہ ھوالموفق للصواب۔**

رحمان آباد

۷ نومبر ۱۹۷۸ء

۵ ذوالحجہ ۱۳۹۸ھ

المدثر

(THE ONE WRAPPED UP, THE CLOAKED ONE, THE MAN WEARING A CLOAK)

56 آیات | مکیّ

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ۔۔۔ المزّمّل ۔۔۔ کی توام ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ نام بھی دونوں کے بالکل ہم معنی ہیں۔ سابق سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس 'قول ثقیل' کے تحمل کے لیے تیاری کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے اس میں اس کا واضح الفاظ میں اظہار کر دیا گیا ہے کہ آپ کمربستہ ہو کر لوگوں کو انذار کریں، مخالفتوں کے علی الرغم اپنے موقف حق پر ڈٹے رہیں۔ دشمنوں کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑیں اور اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں کہ آپ کا فریضہ اس قرآن کے ذریعہ سے لوگوں کو صرف یاددہانی کر دینا ہے، ہر ایک کے دل میں اس کو اتار دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس کو قبول وہی کریں گے جو سنت الٰہی کے مطابق اس کے قبول کرنے کے اہل ہوں گے۔ جو اس کے اہل نہیں ہیں وہ اس سے بیزار ہی رہیں گے خواہ ان کی ہدایت کے لیے آپ کتنے ہی جتن کریں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(1-10) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ آپ کمربستہ ہو کر لوگوں کے انذار کے لیے اٹھیں۔ اپنے رب ہی کی عظمت و کبریائی کا اعلان کریں۔ اپنے دامن دل کو ہر قسم کے غبار سے پاک رکھیں۔ شرک کی ہر چھوت سے دور رہیں۔ اپنی جدوجہد برابر جاری رکھیں اور اپنے رب کی خاطر تمام مخالفتوں کے علی الرغم حق پر ڈٹے رہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو برومند کرے گا اور آپ کی دعوت پھلے پھولے گی۔

(11-17) لوگوں کو قیامت کے ہول سے اچھی طرح آگاہ کر دیں کہ وہ دن کافروں کے لیے بڑا ہی سخت ہو گا، اس کو آسان چیز نہ خیال کریں۔ جو اپنے مال و جاہ کے غرور میں مست اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ جو کچھ انھیں دنیا میں حاصل ہے آخرت ہوئی تو

اس میں بھی انھیں حاصل رہے گا بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ پائیں گے، وہ اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ جب اللہ نے ان کو پیدا کیا تو وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے تنہا اس دنیا میں آئے۔ مال و جاہ میں سے کوئی چیز بھی ان کے ساتھ نہ تھی۔ پھر اللہ نے ان کو مال و اولاد سے نوازا اور ان کے لیے کامیابیوں کی گوناگوں راہیں کھولیں لیکن وہ اپنے رب کے شکرگزار ہونے کے بجائے اس رعونت میں مبتلا ہو گئے کہ جو کچھ انھیں حاصل ہے وہ ان کا پیدائشی حق ہے، جس طرح یہ یہاں حاصل ہے آخرت ہوئی تو اس سے بڑھ چڑھ کر وہاں حاصل ہو گا۔ حالانکہ ان کا یہ زعم بالکل باطل ہے۔ اس میں پھنس کر وہ ہماری آیات کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تو یاد رکھیں کہ اس کی پاداش میں انھیں ایک بڑی ہی سخت چڑھائی چڑھنی پڑے گی۔

(18-25) قریش کے متمردین نے قرآن اور اس کے انذار کی تکذیب کے لیے جو بہانہ تراشا اور جس استکبار کے ساتھ اس کا اظہار کیا اس کی تصویر اور ان کی بدبختی پر اظہار افسوس کہ انھوں نے قرآن کا بہت ہی غلط اندازہ کیا، وہ اس کو پیغمبرؐ کی جادو بیانی کا کرشمہ اور اس کے انذار کو بالکل ناقابل التفات سمجھے حالانکہ اس کی ایک ایک بات حقیقت ہے جو ان کے سامنے آئے گی۔

(26-31) اس دوزخ کی تصویر جس سے اٹکل کے تیر تکے چلانے والوں کو سابقہ پیش آئے گا۔ ساتھ ہی ایک برسر موقع تنبیہ کہ یہ متکبرین چونکہ ہمہ دانی کے زعم میں بھی مبتلا ہیں اس وجہ سے دوزخ کا جو حال ان کو سنایا گیا ہے اس کی بعض باتوں کو وہ مذاق کا ہدف بنا لیں گے، کہیں گے بھلا اس طرح کی باتیں بیان کرنے کا کیا فائدہ؟ حالانکہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ خاص حکمت سے بیان فرما رہا ہے۔ جس کے اندر صلاحیت اور علم کی طلب ہے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے، رہے وہ جو جہل کے باوجود غرور ہمہ دانی میں مبتلا ہیں وہ ان کے سبب سے فتنہ میں مبتلا ہوں گے اور اپنی عاقبت برباد کریں گے۔

(32-48) قیامت کی ایک آفاقی دلیل اور اس کی تکذیب کرنے والوں کی جہالت پر اظہار تعجب کہ وہ اس کائنات کے اس سب سے بڑے حادثہ سے کس طرح نچنت ہیں! قرآن لوگوں کو اس سے آگاہ کر رہا ہے تاکہ جو اس کے لیے تیاری کرنی چاہیں وہ کر لیں اور جو منہ موڑنا چاہتے ہیں ان پر حجت تمام ہو جائے کہ وہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں۔ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس دن ہر شخص اپنے اعمال کے عوض گرو ہو گا۔ اس کا عمل ہی اس کو چھڑائے گا اور عمل ہی جہنم میں لے جائے گا۔ اس دن کسی کی بھی سعی و سفارش ذرا بھی کسی کو نفع نہ پہنچائے گی۔ اس دن کی کامیابی صرف اصحاب الیمین کو حاصل ہو گی۔ وہ جنت میں براجمان ہوں گے اور وہیں گے بیٹھے بیٹھے وہ دوزخ والوں سے معلوم کریں گے کہ وہ دوزخ میں کیوں پڑے تو وہ ان کے جواب میں برملا اپنے جرائم کا اعتراف کریں گے جو ان کی اس بدانجامی کے سبب ہوئے۔

(49 -52) قرآن سے بدکنے والوں کے حال پر تعجب۔ ان کے بدکنے کے اصلی اسباب کی طرف اشارہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ آپ ان لوگوں کی پروانہ کریں۔ آپ کا کام صرف یاددہانی ہے۔ جو لوگ اس یاددہانی سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے وہ اپنا حشر خود دیکھیں گے۔ اس سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جو سنت الٰہی کے تحت اس کے سزاوار ہوں گے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یَا أَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ﴿۱﴾

اے چادر لپیٹے رکھنے والے!

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'مزّمّل' اور 'مدّثّر' کے خطاب کی بلاغت: 'مُدّثّر' اور 'مزّمّل' دونوں کے معنی جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک ہی ہیں۔ 'مُدّثّر' 'دِثَارٌ' سے ہے جو اس چادر کے لیے آتا ہے جو سونے والا اپنے اوپر لے لیا کرتا ہے۔

چادر لپیٹے رکھنا، جیسا کہ ہم نے سابق سورہ میں واضح کیا، آدمی کی فکر مندی کی ایک علامت ہے۔ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو ابتدائے بعثت میں جو مشاہدات و تجربات ہوئے اول تو وہ خود ہی گراں بار کرنے والے تھے پھر جب آپ نے ان کا اظہار اپنے خاندان والوں کے سامنے کیا اور انھوں نے ان کا مذاق اڑانا شروع کیا تو آپ کی فکر مندی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ایسی حالت میں آپ زیادہ تر چادر لپیٹے ہوئے، لوگوں سے الگ تھلگ رہتے جس طرح ایک فکر مند انسان رہتا ہے۔ آپ کی اسی فکر و پریشانی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت پیار سے آپ کو 'مزّمّل' اور 'مدّثّر' سے خطاب فرمایا تاکہ خطاب ہی سے آپ کو تسلی ہو جائے کہ رب کریم آپ کے حال سے اچھی طرح واقف ہے اور جب اس نے اس شفقت سے مخاطب فرمایا ہے تو وہ آپ کی پریشانی دور بھی فرمائے گا۔ چنانچہ سابق سورہ میں آپ کو 'مزّمّل' سے خطاب کر کے قیام لیل کی تاکید فرمائی گئی جس میں اس فکر و پریشانی کا علاج بھی تھا اور اس مہم کے لیے تیاری بھی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

قُمۡ فَأَنذِرۡ ﴿٢﴾

اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

انذار عام کے لیے کھڑے ہونے کا حکم: 'قُمۡ فَأَنۡذِرۡ'۔ یہ اس مہم کا بیان ہے جس کی طرف پچھلی سورہ میں 'اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡكَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا' (5) (ہم تم پر آگے ایک بھاری ذمہ داری ڈالنے والے ہیں) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔یعنی کمربستہ ہو کر اٹھو اور پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنی قوم کو انذار کرو۔ مخالفت و مزاحمت، حالات کی نامساعدات اور ماحول کی اجنبیت کی پروا نہ کرو۔ جب تم ہمت کر کے اٹھ کھڑے ہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری راہ آسان کرے گا اور غیب سے تمہاری تائید کے اسباب فراہم ہوں گے۔سابق سورہ میں یہ اشارہ ہم کر چکے ہیں کہ 'اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡكَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا' (5) سے اسی انذار عام کے حکم کی طرف اشارہ ہے جو یہاں دیا گیا ہے۔ عام طور پر لوگوں نے 'قَوۡلٌ ثَقِیۡلٌ' سے خود وحی کو مراد لیا ہے لیکن وحی تو اس سے پہلے بھی نازل ہو چکی تھی تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ 'ہم عنقریب تم پر ایک قول ثقیل نازل کریں گے!' البتہ انذار کا یہ حکم آپ کے لیے بلاشبہ ایک بہت ہی بھاری حکم تھا۔مکہ اور طائف کے سرداروں کے کانوں میں توحید کی اذان دینا اور وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ آپ اللہ کے رسول ہو کر آئے ہیں، اگر انھوں نے آپ کے انذار کی تکذیب کی تو اس کے عذاب کی زد میں آجائیں گے کوئی سہل کام نہیں تھا۔اس بھاری ذمہ داری سے آپ کا ہراس محسوس کرنا ایک امر فطری تھا۔ چنانچہ ابتداءً آپ نے اپنے کام کو اپنے خاص خاندان والوں ہی تک محدود رکھا اور ان پر بھی نہایت احتیاط کے ساتھ صرف اپنے بعض مشاہدات و تجربات کا اظہار فرما کر ان کا ردعمل معلوم کرنا چاہا جو نہایت مخالفانہ صورت میں سامنے آیا۔ چنانچہ اس دور میں آپ پر نہایت شدید فکرمندی کی حالت طاری رہی۔ جس کی تصویر 'مزّمّل' اور 'مدّثّر' کے الفاظ سے ہمارے سامنے آتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے آپ کو مبعوث فرمایا تھا وہ ہونا تھا چنانچہ پہلے (سورۂ مزمل میں) آپ اس صورت حال کے مقابلہ کے لیے تیاری کی ہدایت ہوئی پھر اس سورہ میں کمر باندھ کر انذار عام کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا حکم ہوا۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرۡ ﴿٣﴾

اور اپنے رب ہی کی کبریائی کی منادی کر۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

توحید خالص کی منادی: یہ اس انذار کا پہلا حکم ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں توحید کوبنیادی حیثیت حاصل رہی ہےیعنی صرف اللہ ہی کی کبریائی و یکتائی کا اعلان۔ مفعول کی تقدیم سے یہاں حصر کا مضمون پیدا ہو گیا ہے۔یعنی اللہ کے سوا جو بھی کبریائی کے مدعی ہیں یا جن کی کبریائی کا بھی دعویٰ کیا جا سکتا ہےوہ سب باطل، تم صرف اپنے رب ہی کی عظمت و کبریائی کا اعلان کرو۔ایک جاہلی معاشرہ میں یہ اعلان ساری خدائی سے لڑائی مول لینے کے ہم معنی تھا لیکن دین کی بنیاد چونکہ اسی کلمہ پر ہےاس وجہ سے ہر نبی کو بے درنگ یہ اعلان کرنا پڑا۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿٤﴾

اور اپنے دامن کو پاک رکھ۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

لفظ 'ثیاب' کا مفہوم: لفظ 'ثِيَابٌ' جمع ہے 'ثَوْبٌ' کی جس کے معنی کپڑے کے ہیں لیکن اس کے معنی دامن کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ کلام عرب کے شواہد سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس مفہوم میں بھی آتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں 'دامن دل' سے تعبیر کرتے ہیں۔امرء القیس کا مشہور شعر ہے:

وان تک قد ساء تک منی خلیقة

فسلی ثیابی من ثیابک تنسل

"اگر میری حرکت تجھے بری ہی لگی ہے تو میرے دامن دل کو اپنے دامن دل سے جدا کر دے تو جدا ہو جائے گی۔"

اس شعر میں شارحین نے 'ثیاب' کو دل ہی کے معنی میں لیا ہے اور یہ معنی اس صورت میں لیے جاسکتے ہیں جب اس کو بطریق استعارہ 'دامن دل' کے مفہوم میں سمجھا جائے۔امرء القیس ہی کا مصرعہ ہے:

ثیاب بنی عوف طھاری نقیّة

"بنی عوف کے دامن بالکل پاک صاف ہیں۔"

لفظ 'ثیاب' کے اس مفہوم کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ تم بالکل بے خوف ہو کر اپنے رب کی کبریائی اور وحدت کی منادی کرو۔ مخالفین خواہ کتنی خاک بازی کریں اور کتنا ہی زور لگائیں لیکن تم اپنے دامن دل پر نجاست شرک کا کوئی چھینٹا نہ آنے دو۔ یہ امر واضح رہے کہ قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں مشرکوں کو نجس اور شرک کو نجاست سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ ہدایت آپ کو اس لیے فرمائی گئی کہ بعد کے مراحل میں قریش کے لیڈروں نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ آپ کی سب باتیں مان لیں گے بشرطیکہ آپ بھی ان کے معبودوں کا کوئی مقام تسلیم کرنے پر راضی ہو جائیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ بات نہایت سختی سے رد فرما دی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی آپ کو نہایت تاکید کے ساتھ یہی ہدایت ہوئی کہ توحید بنیاد دین ہے، اس باب میں آپ کوئی لچک ہرگز قبول نہ کریں 'وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ' (القلم 68:9) (وہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرم پڑو تو وہ بھی کچھ نرم ہو جائیں) اور اسی مضمون کی ایک سے زیادہ آیتوں میں اس صورت حال کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح کی ایک نہایت اہم تنبیہ ہے۔ پیغمبرؐ کو خطاب کر کے مشرکین پر گویا یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ شرک ایک ایسی نجاست ہے جس کا کوئی چھینٹا بھی اللہ کا رسول اپنے دامن پر گوارا کرنے والا نہیں ہے۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿٥﴾

اور ناپاکی کو چھوڑ۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'رُجز' 'رِجز' اور 'رِجس' سب قریب المخرج اور تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس کا استعمال اس گندگی کے لیے ہوتا ہے جس کو دیکھ کر طبیعت میں ارتعاش اور گھن پیدا ہو۔ یوں تو اس سے ہر قسم کی گندگی مراد ہو سکتی ہے لیکن یہاں یہ خاص طور پر شرک کی گندگی کے لیے آیا ہے اور مقصود اسی مضمون کی تاکید ہے جو 'وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ یعنی اپنے دامن کو شرک کے چھینٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شرک کی ناپاکی سے دور رہو۔

اس ہدایت کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ العیاذ باللہ آپ کے کسی شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا۔ آپ جس طرح دورِ اسلام میں طاہر و مطہر رہے اسی طرح جاہلیت میں بھی شرک کے ہر شائبہ سے پاک رہے۔ مقصود صرف کفار و مشرکین کو آگاہ کرنا تھا کہ وہ جان لیں کہ جو منذر ان کے پاس آیا ہے اس کا موقف ان کے دین شرک کے معاملہ میں کیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے اس باب میں کن ہدایات کے ساتھ مبعوث ہوا ہے۔

وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ ﴿٦﴾

اور اپنی سعی کو زیادہ خیال کر کے منقطع نہ کر۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

تالیف کلام کی ایک شکل اور اس کا حل: 'مَنٌّ' کے معنی جس طرح احسان کرنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی چیز کو کاٹ دینے کے بھی آتے ہیں۔ سورۂ قلم میں فرمایا ہے: وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ (3) (اور بے شک تمہارے لیے ایک کبھی نہ منقطع ہونے والا صلہ ہے) یعنی جس انذار و تبلیغ کی تمہیں ہدایت کی جا رہی ہے اس کو برابر جاری رکھنا۔ یہ خیال ترک کر کے کہ اب کافی انذار کیا جا چکا، مزید کی ضرورت نہیں رہی، اس عمل کو منقطع نہ کر بیٹھنا۔ تمہارے رب کی طرف سے جو حکم دیا جا رہا ہے اس پر اس وقت تک قائم و دائم رہو جب تک رب ہی کی طرف سے اس باب میں کوئی اور ہدایت تمہیں نہ ملے۔

'تَسْتَكْثِرُ' یہاں نہی کا جواب نہیں ہے۔ اگر جواب ہوتا تو اس پر جزم آنا تھا۔ اگرچہ بعض قاریوں نے اس کو جزم کے ساتھ بھی پڑھا ہے لیکن متواتر قراءت صرف مصحف کی ہے اس وجہ سے ہمارے نزدیک اس کو ضمّہ کے ساتھ ہی پڑھنا اَولیٰ ہے اور اسی کے مطابق اس کی تاویل بھی ہونی چاہیے۔ اس صورت میں یہ لفظ یا تو حال کے محل میں ہوگا یا اس کو مستقل جملہ کی حیثیت دینی پڑے گی۔ میرے نزدیک یہ حال کے مفہوم میں ہے۔

لفظ 'اِسْتِكْثَارٌ' دو معنوں میں معروف ہے۔ ایک کسی چیز کو زیادہ کرنے اور زیادہ چاہنے کے معنی میں، دوسرے کسی چیز کو زیادہ سمجھ لینے یا زیادہ گمان کر لینے کے معنی میں۔ پہلے معنی کے لیے نظیر 'وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ'

(الاعراف 188:7)والی آیت میں ہے۔ دوسرے معنیٰ کی وضاحت اہل لغت نے یوں کی ہے:**'استکثر الشئُ راٰہ کثیراً او عدّہ کثیرا'** ('استکثر الشئ' کے معنی ہوں گے کسی چیز کو زیادہ خیال کیا یا شمار کیا)

صاحب اقرب الموارد نے اسی معنیٰ کو پہلے لیا ہے۔ میرے نزدیک آیت میں یہ اسی معنیٰ میں آیا ہے۔ مطلب، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، یہ ہو گا کہ انذار کا یہ فرض بغیر کسی وقفہ اور انقطاع کے برابر جاری رکھو، کبھی یہ گمان کر کے چھوڑ نہ بیٹھنا کہ کافی انذار ہو چکا، اب ضرورت نہیں رہی۔

یہ ہدایت اس لیے فرمائی گئی کہ رسول جس فرض انذار پر مامور ہوتا ہے اس کے متعلق سنت الٰہی جیسا کہ جگہ جگہ ہم ذکر کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اگر قوم اس کے انذار کی پروا نہیں کرتی تو ایک خاص مدت تک مہلت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو لازماً ہلاک کر دیتا ہے۔ یہ مہلت اتمام حجت کے لیے ملتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کسی قوم کو اس کے لیے کتنی مہلت ملنی چاہیے۔ رسول کا فرض یہ ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے کام میں لگا رہے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس یہ ہدایت نہ آ جائے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب وہ قوم کو اس کی تقدیر کے حوالہ کر کے اس علاقے سے ہجرت کر جائے۔ اگر رسول بطور خود یہ گمان کر کے قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جائے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تو اندیشہ ہے کہ حالات کا اندازہ کرنے میں اس سے اسی طرح کی غلطی صادر ہو جائے جس طرح کی غلطی حضرت یونس علیہ السلام سے صادر ہوئی۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کہ تنبیہ فرمائی اور ایک سخت امتحان سے گزارنے کے بعد ان کو پھر قوم کے پاس انذار کے لیے واپس بھیجا اور اس دوبارہ انذار سے اللہ تعالیٰ نے ان کی پوری قوم کو ایمان کی توفیق بخشی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کی عجلت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مرحلہ میں یہ آگاہی دے دی کہ تم جس فرض پر مامور کیے جا رہے ہو اس میں برابر لگے رہنا، کبھی ازخود یہ سمجھ کر چھوڑ نہ بیٹھنا کہ اب وہ فرض کافی حد تک ادا ہو چکا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ فیصلہ تمہارے کرنے کا نہیں بلکہ ہمارے کرنے کا ہے۔ 'فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ' (القلم 48:68) (پس صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور مچھلی والے کے مانند نہ بن جانا)اور اس مضمون کی دوسری آیات میں آپ کو صبر و ثبات کی تعلیم دی گئی ہے اور یہاں بھی آگے والی آیت میں یہی مضمون آ رہا ہے۔

ہمارے مفسرین نے عام طور پر اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ تم کسی پر کوئی احسان اس خیال سے نہ کرنا کہ اس کا بدلہ اس سے زیادہ احسان کی صورت میں حاصل کرو، اگرچہ آیت کے الفاظ سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے لیکن سوال کلام کے موقع و محل کا بھی ہے۔ آخر اس سیاق و سباق میں نبی ﷺ کو یہ نصیحت کرنے کا کیا موقع ہے! ہمارا خیال ہے کہ ان حضرات سے آیت کے دونوں

لفظوں کے مفہوم معین کرنے میں مسامحت ہوئی۔ ہم نے ان کی وضاحت کر دی ہے جس سے آیت کا صحیح مفہوم واضح ہو گیا ہے۔ اب اس پر مزید بحث کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴿٧﴾

اور اپنے رب کی راہ میں ثابت قدم رہ۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

اس کا مفہوم وہی ہے جو آیت 'وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا' (الطور 48:52) (اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو، تم ہماری آنکھوں میں ہو) کا ہے۔ 'صَبْرٌ' کے ساتھ جب 'ل' آئے تو اس کے معنی صبر و استقامت کے ساتھ انتظار کرنے کے ہو جاتے ہیں۔

اوپر والی آیت میں حضورؐ کو جو ہدایت ہوئی ہے اسی سے متعلق یہ ہدایت بھی ہے کہ اپنے کام کو کافی سمجھ کر کسی مرحلہ میں چھوڑ نہ بیٹھنا بلکہ صبر واستقامت کے ساتھ اس میں لگے رہنا اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرنا۔ اسی استقامت پر تمہاری کامیابی اور قوم پر اتمام حجت کا انحصار ہے۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ﴿٨﴾ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ﴿٩﴾ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ ﴿١٠﴾

پس جب صور پھونکا جائے گا۔ تو وہ وقت نہایت کٹھن وقت ہو گا! کافروں پر آسان نہ ہو گا!

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت:

انذار کا اصل موضوع: یہ ذکر ہے انذار کے اصل موضوع کا جس سے غفلت ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ نبی ﷺ کی دعوت سے قریش کی مخاصمت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ قیامت کو نہ مانتے تھے نہ ماننا چاہتے تھے۔ وہ اول تو اس کو نہایت مستبعد اور بعید از امکان سمجھتے تھے اور اگر کسی درجے میں مانتے تھے تو اپنی دنیوی کامیابیوں کو دلیل بنا کر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ قیامت ہوئی تو جس طرح

ان کو یہاں سب کچھ حاصل ہے اسی طرح وہاں بھی حاصل ہو گا اور اگر خدا نے ان پر ہاتھ ڈالا ان کے معبود اپنی سفارش سے انھیں بچالیں گے۔ فرمایا کہ اس ہولناک دن سے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دو کہ جب صور پھونکا جائے گا تو وہ دن بڑا ہی کٹھن ہو گا۔

'عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ'۔ یعنی انھوں نے اس کو بہت آسان سمجھ رکھا ہے لیکن کافروں کے لیے یہ دن آسان نہیں ہو گا۔

اوپر والی آیت میں مثبت پہلو سے کہنے کے بعد وہی بات منفی پہلو سے بھی فرمادی جس میں ان احمقوں پر نہایت بلیغ طنز بھی ہے جو اس کو ایک ناقابل اہتمام دن سمجھ کر نچنت بیٹھے تھے کہ جب وہ آئے گا تو دیکھ لیں گے۔ فرمایا کہ وہ کوئی آسان دن نہیں ہو گا، بڑا ہی کٹھن دن ہو گا۔ اس کے لیے جو کچھ کیا جاسکتا ہے آج ہی کیا جاسکتا ہے۔ جس نے آج نہیں کیا وہ ہمیشہ کے لیے پکڑا گیا اور اس طرح پکڑا گیا کہ اس کو کوئی بھی چھڑانے والا نہ بنے گا۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ﴿١١﴾

چھوڑ مجھ کو اور اس کو جس کو میں نے پیدا کیا اکیلا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

مکہ اور طائف کے لیڈروں کو تنبیہ: یہ مکہ اور طائف کے ان برخود غلط لیڈروں کو نہایت تیز و تند لہجہ میں تنبیہ ہے جو اپنی خوشحالی و رفاہیت کو اپنے عقیدہ و عمل کی صحت اور خدا کے منظور نظر ہونے کی دلیل سمجھتے اور یہ توقع رکھتے تھے کہ آخرت ہوئی تو ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں، جیسا کہ ان کو ڈرایا جارہا ہے۔ بلکہ ان کو یہاں جو کچھ حاصل ہے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر وہاں حاصل ہو گا۔ فرمایا کہ ایسے سرپھروں کا معاملہ تم ہمارے اوپر چھوڑو۔ ہم ان سے نمٹنے کے لیے کافی ہیں۔ تم ان کی فکر میں زیادہ پریشانی نہ اٹھاؤ۔

'ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا'۔ یہ وہی اسلوب بیان ہے جو سابق سورہ میں بالکل اسی موقع و محل میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے: 'وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا' (المزمل 11:73) وہاں اس اسلوب کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

'خَلَقْتُ وَحِيدًا' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اس کے ساتھ نہ اس کا مال و جاہ ہوتا ہے نہ اس کا لاؤلشکر۔ یہ چیزیں ملتی ہیں تو خدا کی عنایت سے ملتی ہیں اور یہ اسی وقت تک ساتھ رہتی ہیں جب تک اللہ تعالیٰ چاہتا

ہے۔ ان کا حق یہ ہے کہ انسان ان کو پاکر اپنے رب کا زیادہ سے زیادہ شکر گزار بنے نہ کہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے کہ وہ خدا کا بڑا چہیتا ہے اور آخرت ہوئی تو وہ اس سے بھی زیادہ پائے گا۔ یہ مضمون دوسری جگہ اس طرح ادا ہوا ہے: 'وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَى كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ' (الانعام 94:6) (اور تم ہمارے پاس آئے تن تنہا جس طرح ہم نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا)۔

مطلب یہ ہے کہ تم اس برخود غلط مغرور کو جو دنیا میں آیا تو اسی طرح جس طرح ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ سے تنہا آیا ہے لیکن ہم نے اس کو مال و جاہ عنایت کیا تو وہ اپنے کو بہت بڑی چیز سمجھنے لگا اور اب اس کو آخرت سے ڈرایا جا رہا ہے تو وہ اس رعونت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ آخرت میں اس سے بھی زیادہ کا حق دار ٹھہرے گا۔

اشارہ ایک خاص ذہنیت کی طرف نہ کہ خاص شخص کی طرف: یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص شخص کی طرف اشارہ ہے یا مکہ اور طائف کے عام دولت مندوں کا ذہن بیان ہو رہا ہے؟ مفسرین نے اس سے قریش کے لیڈروں میں سے ولید بن مغیرہ کو مراد لیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ ذہن صرف ولید بن مغیرہ ہی کا نہیں بلکہ قریش کے تمام سرداروں اور دولت مندوں کا تھا اور قریش ہی کی کیا خصوصیت ہے آج بھی جن کو مال و جاہ حاصل ہو جاتا ہے ان کے اندر یہی خناس سما جاتا ہے۔ کوئی ایسا ہی باتوفیق ہوتا ہے جو اس فتنہ سے محفوظ رہتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سمجھنا تو صحیح نہیں ہے کہ یہ آیتیں ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں البتہ ان آیات میں جس ذہن اور جس کردار کی تصویر ہے اس کا ایک مصداق اس کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہم مقدمۂ کتاب میں واضح کر چکے ہیں کہ سلف جب کسی آیت کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ فلاں کے بارے میں ہے تو اس سے ان کی مراد لازماً یہی نہیں ہوتی کہ خاص اسی کے بارے میں نازل ہوئی بلکہ بسا اوقات اس سے ان کا مقصود آیت کے ایک مصداق کی طرف اشارہ کر دینا ہوتا ہے۔ یہ مضمون صرف یہیں نہیں بیان ہوا ہے بلکہ قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے مقصود متمردین کی عام ذہنیت کی طرف اشارہ کرنا ہے نہ کہ کسی خاص شخص کی طرف۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہاں حرف 'مَنْ' استعمال ہوا ہے جو واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کے لیے ضمیریں بھی دونوں ہی طرح آسکتی ہیں۔

وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا ﴿١٢﴾

اور اس کو بخشا مال فراواں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالاً مَّمْدُوداً'۔ یعنی جب وہ دنیا میں آیا تو نہ مال کے ساتھ آیا نہ اولاد کے ساتھ بلکہ اسی طرح بے سر و سامان اور بے خدم و حشم آیا جس طرح دوسرے آتے ہیں۔ یہ اللہ کا اس کے اوپر احسان ہوا کہ اس نے اس کو پھیلا ہوا مال دیا۔ 'پھیلا ہوا مال' سے مراد یہ ہے کہ کہیں اس کے باغ ہیں، کہیں اس کے بنگلے اور کوٹھیاں ہیں، کہیں جانوروں کے گلّے اور ریوڑ ہیں، کہیں رقبے، تجارتی آڑھتیں اور دکانیں ہیں۔۔۔ اس زمانے کے سرمایہ دار ہر ملک کے بنکوں میں اپنے حساب کھولتے اور ہر ملک کی کمپنیوں میں اپنا سرمایہ لگاتے ہیں ان کو بھی اسی ذیل میں شمار کیجیے۔

وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾

اور بیٹے دیے حاضر باش۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'وَبَنِيْنَ شُهُوداً'۔ مال کے ساتھ اللہ نے اس کو بیٹے بھی دیے جو ہر مجلس، ہر مقام اور ہر محاذ پر اس کے ساتھ کھڑے ہونے والے اور اس کے پھیلے ہوئے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانے والے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قبائلی زندگی میں خاندانی عصبیت و جمعیت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مدافعت و مقابلہ کا تمام تر انحصار اس پر تھا۔ قوم و قبیلہ میں سرداری کا مقام اسی کو حاصل ہوتا جس کے بیٹے زیادہ اور کنبہ بڑا ہو اور بیٹے ایسی صلاحیت و قابلیت رکھنے والے ہوں کہ ہر ضرورت کے موقع پر باپ کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑے ہو سکیں۔ لفظ 'شُهُود' اسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ﴿۱۴﴾

اور اس کے لیے خوب راہ ہموار کی۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا'۔ یعنی اس طرح مال و اولاد دے کر اس کے لیے عزت و وقار اور امارت و سیادت کے حصول کے لیے اچھی طرح راہ ہموار کر دی۔

ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ﴿١٥﴾

پھر وہ یہ توقع رکھتا ہے کہ میں اس کے لیے اور زیادہ کروں گا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

'ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کا حق تو یہ تھا کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار و فرماں بردار بندہ بنتا لیکن ہوا یہ کہ وہ نعمتیں پا کر اکڑنے اور اترانے والا بن گیا۔ جب اس کو ڈرایا جاتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جو ناشکروں اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہو گا تو وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اگر فی الواقع کوئی ایسا دن آیا تو اس دن وہ اس سے بھی زیادہ پائے گا جو اس کو یہاں حاصل ہے۔

كَلَّا ۖ إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ﴿١٦﴾

ہر گز نہیں! وہ تو ہماری آیتوں کا دشمن نکلا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

برخود غلط مدعیوں کو جواب: یہ اس قسم کے برخود غلط لوگوں کے زعم باطل کی نہایت شدت کے ساتھ تردید ہے۔ فرمایا کہ ان کا یہ خواب ہر گز پورا ہونے والا نہیں ہے۔ اللہ نے ان کو جو نعمتیں دیں نہ ان کے حق کی حیثیت سے دیں نہ ان کے حاصل ہونے میں ان کی تدبیر یا ان کے تدبر کو کوئی دخل ہے بلکہ محض اپنے فضل و کرم سے یہ امتحان کرنے کے لیے دیں کہ دیکھے وہ اپنے رب کے شکر گزار و فرماں بردار رہتے ہیں یا خود سر، مغرور اور خدا کے باغی اور زمین میں فساد برپا کرنے والے بن جاتے ہیں۔ اس امتحان سے ثابت ہو گیا کہ وہ نعمتیں پا کر اللہ کی آیتوں کے دشمن بن گئے۔ 'آیات' سے مراد بحیثیت مجموعی قرآن اور خاص طور پر اس کی وہ

آیتیں ہیں جو عذاب دنیا اور عذاب آخرت سے ڈرانے والی اور اس امر واقعی سے آگاہ کرنے والی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ اس دنیا میں کوئی مصرف ہے اور نہ آخرت میں اس کے سوا کوئی مولیٰ و مرجع بنے گا۔

سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا ﴿١٧﴾

میں اس کو عنقریب ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

نعمتوں کی ناشکری کرنے والوں کی سزا: 'اِرْهَاقٌ' کے معنی کسی مشقت میں ڈالنے کے ہیں اور 'صَعُوْدٌ' کسی ایسی چوٹی یا گھاٹی کو کہتے ہیں جس کو عبور کرنا نہایت دشوار ہو۔

یہ سزا بیان ہوئی ہے اس انعام کی ناقدری کی جس کی طرف اوپر 'وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ نعمتیں پا کر چونکہ وہ انہی کے پرستار بن کر رہ گئے اور اصل منعم کو بھول کر اپنے نفس ہی کی بندگی میں اس طرح لگ گئے کہ اس کی کسی خواہش کا بھی مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے اس وجہ سے ان کو آخرت میں ایک نہایت پر مشقت چڑھائی چڑھنی پڑے گی۔

نیکی اور بدی کے مزاج کا فرق: یہاں نیکی اور بدی کی یہ فطرت پیش نظر رہے کہ ان دونوں کا امتیاز تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس امتحان میں بھی اس کو ڈال دیا کہ بدی کی لذتیں تو عاجل رکھی ہیں اور تلخیاں اس کی آخرت میں سامنے آئیں گی۔ برعکس اس کے نیکی کی مشکلیں نقد ہیں اور نفع اس کا نسیہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس میں قدم قدم پر اس کو نفس کی مزاحمت کے سبب سے چڑھائیاں چڑھنی اور گھاٹیاں پار کرنی پڑتی ہیں اور بدی کی راہ اختیار کرے تو اس کی لذت تو اس کو نقد نقد ملتی ہے اور اس کے انجام بد کا معاملہ اس کے نزدیک موہوم ہوتا ہے۔ اس کشش کے سبب سے اکثریت اسی راہ کو اختیار کر لیتی ہے۔ نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ صرف وہی کرتے ہیں جن کے اندر صبر اور عزیمت ہو اور اس وصف کو پیدا کرنے کے لیے آدمی کو ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف حضرت مسیح علیہ السلام نے یوں اشارہ فرمایا ہے کہ 'بدی کی راہ فراخ اور اس پر چلنے والے بہت ہیں اور نیکی کی راہ تنگ اور اس پر چلنے والے تھوڑے ہیں'۔ سورۂ بلد میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے:

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (البلد 90:10-17)

"اور ہم نے انسان کو نیکی اور بدی دونوں کی راہیں سمجھا دیں۔ پس اس نے گھاٹی پار کرنے کا حوصلہ نہ کیا اور تم کیا سمجھے کہ گھاٹی کیا ہے! غلام کی گردن چھڑانا یا بھوک کے زمانے میں کسی قرابت مند یتیم یا کسی خاک نشین مسکین کو کھلانا۔ مزید برآں یہ کہ وہ بنے ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور مرحمت کی تلقین کی۔"

قرآن نے آخرت کی فوز و فلاح کا حق دار صرف انہی کو ٹھہرایا ہے جو دنیا میں نیکی کی راہ کے عقبات کو پار کرنے کا حوصلہ کریں گے۔ جو یہاں ان کو پار کرنے کی ہمت نہیں کریں گے ان کو دوزخ کے عقبات سے سابقہ پیش آئے گا جن کو پار کرنے پر وہ مجبور کیے جائیں گے لیکن وہ ان کو پار نہ کر سکیں گے۔

إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿١٨﴾

اس نے سوچا اور ایک بات بنائی۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

معاندین قرآن کے عناد کی تصویر: آیت 16 میں یہ جو فرمایا ہے کہ 'وہ ہماری آیات کا شدید معاند ہے' یہ اسی عناد کی تصویر کھینچی گئی ہے اور غور سے دیکھیے کہ کیسی مکمل تصویر کھینچی گئی ہے۔

'إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ'۔ یعنی جب قرآن اس کو سنایا گیا تو اس نے اپنا ردعمل فوری طور پر ظاہر کرنے کے بجائے کچھ دیر غور کرنے کا تکلف کیا تاکہ دیکھنے والوں پر یہ اثر پڑے کہ ان کا لیڈر مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر کے اپنی رائے ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ 'وَقَدَّرَ' یعنی غور کرنے کے بعد جو رائے اس کے ذہن میں آئی اس کو اس نے اپنے ذہن میں اچھی طرح تولا کہ وہ ایسی بات کہے جو دلوں میں اتر جائے اور ہر شخص پکار اٹھے کہ جو رائے ظاہر کی گئی ہے نہایت صائب ہے۔

فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿٢٠﴾

پس ہلاک ہو، کیسی بات بنائی! پھر ہلاک ہو، کتنی غلط بات بنائی!

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت:

'فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ'۔ لیکن وہ غارت ہو کہ اس نے قرآن کا کتنا غلط اندازہ کیا! اور پھر غارت ہو کہ اس نے کتنی بے ہودہ رائے قائم کی۔ رائے کے ذکر سے پہلے دو مرتبہ اس تاکید کے ساتھ اس پر لعنت سے مقصود اس کی رائے کی شناعت کا اظہار بھی ہے اور سننے والوں کو متنبہ کرنا بھی کہ جب آدمی کی مت ماری جاتی ہے تو وہ اسی طرح پاگلوں کی سی باتیں کرتا اور گھر کو پشیز ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے برابر کا مدبر کوئی دوسرا نہیں ہے۔

ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾

پھر اس نے نظر دوڑائی۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بنایا۔ پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت:

'ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ'۔ یہ اس کے اس متکبرانہ انداز کی تصویر ہے جو اس نے رائے ظاہر کرتے ہوئے اختیار کیا۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن نے ایسی مکمل تصویر کھینچی ہے کہ اگر اس کے بعد اس کی رائے کا ذکر نہ بھی ہوتا جب بھی ایک اداشناس نہایت آسانی سے سمجھ لیتا کہ یہ انداز کس رائے کی غمازی کر رہا ہے۔ فرمایا کہ پہلے تو اس نے تفکر سے سر اٹھا کر لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیا تا کہ ان کے موڈ کا اندازہ کر سکے کہ اس رائے کے اظہار کے لیے ساعت ساز گار ہے یا نہیں۔ پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بنایا تا کہ دیکھنے والوں کو اس کے اس انداز ہی سے پتا چل جائے کہ اس غور و فکر کے بعد اس نے قرآن کے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ نہایت ہی مایوس کن ہے۔ پھر وہ نہایت استکبار کے ساتھ پیٹھ پھیر کر وہاں سے کچھ بڑبڑاتا ہوا چل کھڑا ہوا۔

فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ﴿٢٤﴾ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾

پس بولا" یہ تو محض ایک جادو ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ یہ تو محض انسانی کلام ہے!"

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت:

'فَقَالَ إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ۝ إِنْ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ'۔ اگرچہ اوپر کی تصویر و تمثیل کے بعد کسی مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی بلکہ اداؤں اور حرکتوں ہی نے سارا راز کھول دیا تھا تاہم قرآن نے اس کے الفاظ بھی نقل کر دیے کہ وہ کیا زہر اگلتا ہوا نہایت استکبار کے ساتھ پیچھے مڑا۔ فرمایا کہ اس نے کہا کہ یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے اور یہ محض بشری کلام ہے۔

قرآن کو جادو کہنے کا ایک پہلو: قریش کے لیڈروں کی زبان سے قرآن کو جادو کہنے کی وجہ اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ اس کی بے مثل فصاحت و بلاغت اور اس کی بے پناہ تاثیر و تسخیر کا انکار جب ان کے لیے ممکن نہیں رہا تو اس کے خلاف انھوں نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ یہ جادو ہے تاکہ عوام کے دلوں پر اس کے الہامی و خدائی کلام ہونے کا رعب جو بیٹھتا جا رہا تھا اس کا توڑ کریں۔ اس کو جادو کہہ کر وہ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ اس کے اندر جو تاثیر و تسخیر ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ آسمان سے اترا ہوا کلام ہے بلکہ یہ محض الفاظ و زبان کی جادوگری ہے اور یہ کوئی ایسی نادر چیز نہیں ہے جو پہلی مرتبہ ظہور میں آئی اور قرآن ہی کے ساتھ مخصوص ہو بلکہ یہ پہلے سے چلی آرہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے اس ملک میں اس سے پہلے بھی ایسے خطیب و شاعر گزر چکے ہیں جن کے کلام میں یہ جادو موجود تھا لیکن ان کو نہ کسی نے خدا کا فرستادہ مانا نہ انھوں نے خود کوئی فرستادہ ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ ان کے کلام کو کسی نے کلام الٰہی سمجھا تو اسی کلام کی کیا خصوصیت ہے کہ اس کو خدائی ہونے کا درجہ دے دیا جائے!

'إِنْ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ'۔ یعنی یہ محض بشری کلام ہے۔ اس کے ساحرانہ اسلوب بیان کو جتنی اہمیت چاہو دو۔ ہم کو اس سے انکار نہیں ہے لیکن اس کو آسمان پر چڑھانے کی کوشش نہ کرو۔

سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ ﴿٢٧﴾ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾

میں اس کو عنقریب دوزخ میں داخل کروں گا۔ اور کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے! نہ ترس کھائے گی اور نہ چھوڑے گی۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

متکبروں کا انجام: یہ انجام بیان ہوا ہے اس قسم کے متکبروں کا۔ فرمایا کہ ہم اس کو عنقریب دوزخ میں داخل کریں گے۔

'وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سَقَرُ'۔ یہ اس دوزخ کی ہولنا کی کا اظہار ہے کہ تم کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے! یعنی کوئی اس کو معمولی چیز نہ سمجھے۔ اس کی ہولنا کی کا اندازہ یہاں سے نہیں ہو سکتا۔ اس کو وہی جانیں گے جن کو اس سے سابقہ پیش آئے گا۔ بد قسمت ہے وہ جو اس سے بے پروا ہو کر زندگی گزارے! اس طرح کا خطاب عام ہوتا ہے اس کو حضور ﷺ کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

'لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ'۔ 'اَبْقٰى عَلَيْهِ' کے معنی ہوتے ہیں اس نے اس پر ترس کھایا اور رحم کیا۔ یہاں اگرچہ صلہ مذکور نہیں ہے، اس کے اظہار کا موقع نہیں تھا، لیکن یہ فعل استعمال یہاں اسی معنی میں ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دوزخ ایسی ظالم چیز ہوگی نہ کسی پر ذرا ترس کھائے گی کہ اس کے عذاب میں کچھ تخفیف ہو جائے نہ کسی کو نظر انداز کرے گی کہ وہ اس سے بچ نکلے۔ یعنی نہ اس سے رحم کی کوئی امید نہ نظر انداز کیے جانے کی۔ وہ بالکل بے رحم بھی ہوگی اور پوری طرح چوکس بھی!

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾

چمڑی کو جھلس دینے والی۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

"بشر" جسم کی کھال کے معنی میں ہے۔ یعنی اس کے شعلوں کی لپٹ کا یہ حال ہو گا کہ دور ہی سے مجرموں کی کھالوں کو جھلس دے گی۔ دوسرے مقام میں نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى –المعارج:۱۶– کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یہ جہنم کی شدت تماز کے وہ اثرات بیان ہوئے ہیں جو مجرموں پر اصل مقام عذاب تک پہنچنے سے پہلے ہی پڑنے شروع ہو جائیں گے۔ مقصود یہ دکھانا ہے کہ جس عذاب کی ابتدا یہ ہوگی اس کی انتہا کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾

اس پر انیس فرشتے مقرر ہوں گے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

آیت تشابہات سے متعلق ایک سوال کا جواب: فرمایا کہ اس کے اوپر انیس مامور ہوں گے۔ یہاں انیس کا معدود مذکور نہیں ہے لیکن آگے کی آیت میں اشارہ موجود ہے کہ یہ فرشتے ہوں گے۔ یہاں ان کے ذکر میں ابہام سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کی مزاجی خصوصیات، ان کی شکلیں اور ان کی قوتیں بالکل اس ڈیوٹی سے مناسبت رکھنے والی ہوں گی جس پر وہ مامور ہوں گے۔ مجرم ان کو دیکھ کر ہی یہ اندازہ کر لیں گے کہ یہ کسی پر نہ رتی برابر ترس کھانے والے ہیں اور نہ ان کے چنگل سے چھوٹ سکنے کا کوئی امکان ہے۔

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ دوزخ پر مامور فرشتوں کی تعداد انیس ہونے میں کیا حکمت ہے اور بالفرض ان کی تعداد انیس ہی ہے تو اس اہتمام سے اس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ اس سوال کا جواب آگے والی آیت میں خود قرآن نے دیا ہے لیکن اس جواب سے پہلے ایک ضروری تمہید ذہن نشین کر لیجیے۔

وہ یہ کہ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس کے دلائل عقل و فطرت اور آفاق و انفس میں موجود ہیں اور قرآن نے پوری وضاحت سے وہ بیان کر دیے ہیں۔ رہیں جنت و دوزخ کی تفصیلات تو ان کی نوعیت تشابہات کی ہے جن کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اس نے ان کو تمثیلات و تشبیہات کے پیرایہ میں سمجھایا ہے جن سے ہم فی الجملہ ان کا تصور تو کر سکتے ہیں لیکن ان کی اصل حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اگر آدمی ان کی اصل حقیقت جاننے کے درپے ہو تو وہ فتنہ میں پڑ جاتا ہے اور اس سے کچھ کرنا تو درکنار وہ اس اصل حقیقت کا بھی منکر بن جاتا ہے جس کی بنیاد عقل و فطرت کے قطعی دلائل پر ہوتی ہے۔ اس طرح کے معاملات میں ایک عاقل کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے اس کو مانے اور یہ ایمان رکھے کہ ان کی اصل حقیقت اس دن واضح ہو گی جس دن یہ سامنے آئیں گی۔ اس نکتہ کی وضاحت قرآن نے سورۂ آل عمران میں یوں کی ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا. (آل عمران 7:3)

وہی خدا ہے جس نے تم پر کتاب اتاری ہے جس میں (عقل و فطرت کے دلائل پر مبنی) محکم آیات ہیں جن کو اصل کتاب کی حیثیت حاصل ہے اور کچھ متشابہ آیات بھی ہیں (جن میں کوئی بات تمثیلی رنگ میں سمجھائی

گئی ہے) تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ جوئی اور اس کی اصل حقیقت کی دریافت کے زعم میں اس کی متشابہات ہی کے درپے ہوتے ہیں حالانکہ اس کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ رہے وہ لوگ جن کے قدم علم میں خوب جمے ہوئے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ متشابہات بھی محکمات ہی کی طرح ہمارے رب ہی کے پاس سے نازل ہوئی ہیں۔

اس قسم کے کج روذہن کے لوگ ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ قریش کے لیڈروں اور اہل کتاب کے مفسدین میں بھی ایسے لوگ موجود تھے اس وجہ سے قرآن نے جب انیس فرشتوں کا ذکر کیا تو برسر موقع تنبیہ بھی فرمادی (جو آگے آرہی ہے) کہ اگرچہ فتنہ پسند طبیعتیں اس کو فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنائیں گی لیکن اللہ تعالیٰ اس قسم کے حقائق اس لیے بیان فرماتا ہے کہ اس سے ان لوگوں کے علم میں اضافہ ہو جو علم کے طالب ہیں، اور جن کے اندر فتنہ جوئی کا ذوق ہے اور ان کا کھوٹ ابھر کر سامنے آئے۔۔۔اس تمہید کو سامنے رکھ کر آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ۙ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا ۙ وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ ۙ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ ﴿٣١﴾

اور ہم نے دوزخ پر نگران تو فرشتوں ہی کو بنایا ہے اور ہم نے ان کی یہ تعداد نہیں بیان کی مگر اس لیے کہ یہ آزمائش بنے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا تاکہ یقین حاصل کریں وہ جن کو کتاب عطا ہوئی اور اہل ایمان اس سے اپنے ایمان کو بڑھائیں اور اہل کتاب اور اہل ایمان شک میں نہ پڑیں۔ اور تاکہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ اور کفر کرنے والے کہیں کہ بھلا اس سے اللہ کی کیا مراد ہے! اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور راہ یاب کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے۔ اور یہ ماجرا محض انسانوں کی یاددہانی کے لیے ہے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

متشابہات کے ذکر کی حکمت: یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بر سر موقع ایک تنبیہ ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہ آیت بہت بعد میں مدینہ کے دور میں نازل ہوئی سابق آیت سے حرف عطف کے ساتھ اس کا اتصال قرینہ ہے کہ یہ ساتھ ہی نازل ہوئی ہے۔ بعد میں نازل ہونے والی آیتیں، جو اپنے سابق حکم کے ساتھ ملائی گئی ہیں، ان کا انفصال ہر جگہ نمایاں ہے۔ سورۂ مزمل میں 'إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ.....' (20) والی آیت مدنی دور کی آیت ہے۔ چنانچہ سابق آیت سے اس کا انفصال نمایاں ہے۔ اس کو حرف ربط کے ذریعہ سے مربوط نہیں کیا لیکن یہاں یہ حرف عطف کے ذریعہ سے مربوط ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ آیت بھی ساتھ ہی نازل ہوئی اور مقصود اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مفسدین کے ذہن سے فی الجملہ آگاہ کر دینا ہے کہ جب تمہاری زبان سے وہ اس کی باتیں گے تو طرح طرح سے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کریں گے لیکن تم ان کی یاوہ گوئیوں کی پروانہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ یہ باتیں اس لیے بیان فرماتا ہے کہ اس سے اہل ایمان کے علم میں اضافہ ہو اور جن کے اندر فتنہ جوئی کی بیماری ہے ان کا کھوٹ ابھر کر سامنے آ جائے۔

'وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا'۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے کارخانۂ قدرت کے تمام شعبوں پر فرشتوں ہی کو مامور فرمایا، جنوں اور شیاطین کو نہیں مامور کیا، اسی طرح دوزخ پر بھی اس نے فرشتوں ہی کو مامور کیا۔ کسی دوسری مخلوق کو نہیں کیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کی پیدا کی ہوئی پاکیزہ مخلوق ملائکہ ہی کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے تاکہ کسی گوشے میں سرمو کوئی بات اس کے منشا کے خلاف نہ ہو۔ چنانچہ دوزخ کے جیل خانہ پر بھی اس نے فرشتوں ہی کو مامور فرمایا ہے۔

اس فقرے میں نہایت لطیف طریقہ سے ان فتنہ پردازوں کا جواب بھی دے دیا جو بات بنا سکتے تھے کہ یہ لو، جب مجرموں کے ساتھ فرشتے بھی دوزخ میں ہوں گے تو پھر کیا ڈر ہے، جس طرح وہ گزاریں گے ہم بھی گزار لیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح کی دل لگی کی باتیں وہ کرنی چاہیں تو کر لیں لیکن یاد رکھیں کہ جیل پر مامور افسروں اور جیل کے قیدیوں کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اس کا پتہ ان کو اس وقت چلے گا جب دوزخ کے جیل اور اس پر مامور فرشتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔

اللہ تعالیٰ نے زندگی کے ہر شعبہ میں امتحان رکھے ہیں: 'وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا'۔ یہ ان فرشتوں کی تعداد کے ذکر کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا کہ اس کے اظہار سے مقصود یہ ہے کہ ان کی تعداد کا مسئلہ قیامت کے منکروں کے لیے ایک آزمائش ہے اور اس کی آڑ لے کر وہ جو کچھ اس کے خلاف کہنا چاہیں کہہ لیں۔ یہ امر واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے ہر گوشے میں امتحان رکھے ہیں جن کے ذریعہ سے بروں کی مخفی برائیاں اور اچھوں کی مستور نیکیاں ظہور میں آتی ہیں۔ یہ امتحان نہ ہوں تو

انسان کی مخفی صلاحیتیں اجاگر ہو سکتیں نہ نیک اور بد کے درمیان امتیاز ہو سکے۔ چنانچہ جنت اور دوزخ کی تفصیلات کے ذیل میں بھی اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی حقیقتوں کا ذکر فرمایا جو منکروں کے لیے فتنہ بن گئیں۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے جو مشاہدات بیان فرمائے یا دوزخ کے اندر قرآن نے زقّوم کا جو ذکر کیا تو مخالفین نے ان کو موضوع بحث بنا کر طرح طرح سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مذاق اڑایا اور جنت و دوزخ کا بھی۔ سورۂ بنی اسرائیل میں اس کی طرف یوں اشارہ ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلاَّ فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي القُرْآنِ (بنی اسرائیل 17:60)

”اور ہم نے جو رؤیا تم کو دکھائی تو اسی لیے دکھائی کہ وہ مخالفوں کے لیے آزمائش بنے۔ اسی طرح اس درخت کو بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے۔“

شیاطین جن و انس کو حق کے خلاف فتنے برپا کرنے کے اس طرح کے مواقع اللہ تعالیٰ جو دیتا ہے اس کی حکمت بھی قرآن میں جگہ جگہ واضح فرمادی گئی ہے۔ سورۂ حج میں فرمایا ہے:

لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ (الحج 22:53-54)

”اللہ یہ موقع اس لیے دیتا ہے کہ شیاطین جو کچھ حق کے خلاف کہیں وہ ان لوگوں کے لیے فتنہ بنے جن کے دلوں میں روگ ہے یا جن کے دل سخت ہو چکے ہیں اور یہ ظالم بہت دور کے جھگڑے میں پڑ چکے ہیں اور تاکہ وہ لوگ جن کو علم عطا ہوا ہے جان لیں کہ یہ جو قرآن نے بتایا ہے یہی حق ہے۔“

سورۂ حج کی اس آیت کے تحت اس مسئلہ پر ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ وضاحت مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

اسی طرح یہاں بھی جب دوزخ کے فرشتوں کا ذکر انیس 19 کی تحدید کے ساتھ فرمایا تو یہ آگاہی بھی دے دی کہ اگرچہ اشرار اس کو فتنہ کا ذریعہ بنائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق یہ امتحان ضروری ہے۔ اسی سے ان لوگوں کا کھوٹ ابھر کر سامنے آئے گا جن کے دلوں کے اندر خرابی ہے اور اسی سے ان لوگوں کے علم اور ایمان میں پختگی پیدا ہو گی جن کے اندر حق کی طلب اور حقیقت کی جستجو ہے۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ متمردین قریش نے سنا کہ دوزخ پر کل انیس ہی فرشتے مامور ہوں گے تو انھوں نے مذاق اڑایا کہ اگر کل اتنے ہی ہوں گے تو پھر کوئی اندیشہ کی بات نہیں ہے ہم ان سے آسانی سے نمٹ لیں گے۔ بعض نے شیخی بگھاری کہ ان میں سے اتنے کے لیے تو یہ بندہ تنہا ہی کافی ہے، باقی رہے اتنے تو ان سے اے فلاں! تم نمٹ لینا۔

'لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا إِيْمَانًا'۔ 'ل' یہاں نتیجہ کے بیان کے لیے ہے۔ یعنی حق و باطل کی اس کشمکش کا یہ نتیجہ نکلے گا جو سچے اہل کتاب ہیں اس سے ان کا یقین محکم ہو گا اور جو ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں افزونی ہو گی۔

'أُوْتُوا الْكِتٰبَ' سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اچھے اہل کتاب مراد ہیں۔ اہل کتاب میں سے جو اپنی کتابوں پر واقعی ایمان رکھتے تھے ان کے لیے قرآن کی اس طرح کی باتوں کا مذاق اڑانے کی گنجائش نہیں تھی۔ خود ان کے صحیفوں میں اس طرح کی باتیں موجود تھیں۔ قرآن سے ان کو تائید مل گئی جس سے ان کا یقین محکم ہوا۔ یہی اہل کتاب ہیں جو بعد میں قرآن پر ایمان لائے۔

تقلیدی ایمان ضعیف ہوتا ہے: اہل ایمان کے ایمان میں افزونی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اس کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ ان کے آگے آجاتا ہے اور وہ اچھی طرح پرکھ لیتے ہیں کہ مخالفین کی نکتہ چینیاں بالکل بے وزن ہیں۔ ضد کی صحیح شناخت اس کے ضد ہی سے ہوتی ہے۔ دونوں پہلوؤں کے سامنے آجانے کے بعد آدمی جس پہلو کو اختیار کرتا ہے علی وجہ البصیرت اختیار کرتا ہے۔ اگر وہ ایمان کے پہلو کو اختیار کرتا ہے تو اس کا ایمان تقلیدی نہیں ہوتا بلکہ سمجھ بوجھ کر ہوتا ہے۔ اس کو وہ پورے جزم کے ساتھ اختیار کرتا ہے اور ہر آزمائش اس کے ایمان میں اضافہ کرتی ہے۔ جن کا ایمان محض تقلیدی ہوتا ہے اس کی جڑ مضبوط نہیں ہوتی اس وجہ سے معمولی بادِ مخالف بھی بسا اوقات اس کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔

'وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ'۔ وہی بات منفی پہلو سے فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امتحان میں اس لیے ڈالتا ہے کہ جو سچے اہل کتاب ہیں وہ اور اہل ایمان شک کے حملوں سے محفوظ ہو جائیں۔ گویا یہ شک کے حملوں سے محفوظ کر دینے کے لیے ایک پیشگی احتیاطی تدبیر ہے۔

اچھے اہل کتاب کی تعریف: یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ اہل ایمان کے پہلو بہ پہلو اچھے اہل کتاب کا بھی ذکر آیا ہے حالانکہ یہ سورہ، جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے جب کہ اہل کتاب سے براہ راست سابقہ پیش نہیں آیا تھا چنانچہ جن لوگوں نے اس آیت کو مدنی قرار دیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی انھوں نے بتائی ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اچھے اہل کتاب مسلمانوں ہی کے حکم میں تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے ان کا ذکر اہل ایمان کے ہراول دستہ کی حیثیت سے کیا تاکہ پہلے ہی سے ان پر واضح ہو جائے کہ اس نئی بعثت کے دور میں انھیں کیا رول ادا کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کی نظروں میں ان کی کیا جگہ ہے، آگے انھیں کن حالات سے گزرنا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو محکم رکھنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار فرما رہا ہے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے انھیں کس طرح بیدار رہنا چاہیے۔

حاسد یہود کا رویہ: 'وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلاً'؛ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ حاسد یہود اور کٹر کفار پر ان متشابہات کا کیا اثر پڑے گا۔

'اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ' سے عام طور پر لوگوں نے منافقین کو مراد لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ لفظ 'مَرَضٌ' قرآن میں نفاق ہی کے لیے آیا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس کتاب میں جگہ جگہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ حسد اور کینہ کی تعبیر کے لیے بھی آیا ہے اور ایسے مواقع میں اس سے مراد یہود ہوا کرتے ہیں اس لیے کہ ان کو بنی اسمٰعیل پر بھی حسد تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اس حسد کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اوپر اچھے اہل کتاب کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب ان کے مقابل میں حاسد یہود کے رویہ کا ذکر آ رہا ہے اور ساتھ ہی 'اَلْكَافِرُوْنَ' کے لفظ سے کفار قریش کی طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ یہ دونوں گروہ ان متشابہات کے بارے میں ایک ہی روش اختیار کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ 'مَاذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلاً'۔

ان کے اس قول کی وضاحت سورۂ بقرہ کی آیت 26 کے تحت ہم کر چکے ہیں کہ اس طرح کی باتیں سن کر وہ ناک بھوں چڑھائیں گے اور متکبرانہ انداز میں کہیں گے کہ بھلا اس طرح کی تمثیلات سے اللہ کی مراد کیا ہے! یعنی یہ باتیں لایعنی ہیں اور اللہ تعالیٰ لایعنی باتیں نہیں کرتا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی باتیں منسوب کر رہا ہے (العیاذ باللہ) وہ بھی لایعنی اور اس کا دعوائے رسالت محض افتراء ہے۔

'كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِيْ مَن يَشَاءُ'۔ یعنی اس طرح کی آزمائشوں اور امتحانوں میں ڈال کر اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت نصیب کرتا ہے۔ یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کی وضاحت جگہ جگہ ہم کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مشیت اس کی حکمت کے تحت ہے۔ جن کو وہ گمراہی کا مستحق پاتا ہے ان کو گمراہ کرتا ہے اور جو اس کی سنت کے تحت ہدایت کے سزاوار ہوتے ہیں ان کو ہدایت بخشتا ہے۔ بالکل اسی سیاق وسباق میں سورۂ بقرہ میں یوں فرمایا گیا ہے:

فَأَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلاً يُضِلُّ بِهِ كَثِيْراً وَيَهْدِيْ بِهِ كَثِيْراً وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلاَّ الْفَاسِقِيْنَ (البقرہ 2:26)

"جو ایمان لائے وہ جانتے ہیں کہ یہی حق ہے ان کے رب کی جانب سے۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا تو وہ کہیں گے کہ بھلا اس طرح کی تمثیل سے اللہ کی کیا مراد ہو سکتی ہے! اللہ اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ اس سے گمراہ انہی کو کرتا ہے جو نافرمان ہوتے ہیں۔"

نکتہ چینوں کے غرور ہمہ دانی پر ضرب: وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ۔ یہ ان نکتہ چینوں کے غرور ہمہ دانی پر ضرب لگائی ہے کہ وہ اس زعم میں نہ رہیں کہ اس کائنات کے تمام بھیدوں کو وہ جانتے ہیں یا ان کے پاس اتنا علم اور اتنی عقل ہے کہ ان کو جان سکتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ زعم بالکل باطل ہے۔ تیرے رب کی فوجوں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ وہی جانتا ہے کہ اس کی افواج کتنی ہیں، اس میں کس یونٹ کی صلاحیتیں کیا ہیں، کون سی رجمنٹ کن اسلحہ سے لیس ہے اور کون اور کتنے افسر کس محاذ پر مامور ہیں۔ نہ کوئی ان ساری باتوں کو جانتا ہے اور نہ جان سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رموز سلطنت میں سے جن بھیدوں سے آگاہ کر دے انسان کو چاہیے کہ ان کی قدر کرے اور ان کو اپنے خزانۂ علم میں بیش بہا اضافہ سمجھے۔ اس گھمنڈ میں نہ مبتلا ہو کہ خدا کی کائنات اتنی ہی ہے جتنی اس نے دیکھی ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دور کے دانش فروشوں نے بھی قرآن کی جن باتوں پر شبہات وارد کیے ہیں یا جن کی من مانی تاویلیں کرنے کی کوشش کی ہے اسی غرور ہمہ دانی میں مبتلا ہو کر کی ہے۔ جو باتیں ان کو اپنی محدود عقل کی گرفت سے باہر محسوس ہوئیں ان کا یا تو انکار کر دیا، اگر انکار کی جرأت ہوئی، ورنہ ان کی کوئی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی جو انکار سے بھی کئی قدم آگے ہوئی۔

وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ۔ یہ مقصد بتایا ہے قیامت کے احوال پر مشتمل ان آیات کا۔ فرمایا کہ یہ انذار کرنے والی آیتیں ہم نے نکتہ چینی کے لیے نہیں نازل کی ہیں بلکہ لوگوں کی تذکیر و تنبیہ کے لیے نازل کی ہیں تاکہ جو اس ابدی عذاب سے بچنا چاہتے ہیں وہ اس کے ظہور سے پہلے پہلے تیاری کر لیں۔ اللہ نے یاددہانی سنا کر خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اس سے فائدہ اٹھانا لوگوں کا اپنا کام ہے۔ جو فائدہ نہیں اٹھائیں گے ان کے پاس خدا کے آگے کوئی عذر نہیں ہو گا۔ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ وہ نیک و بد سے لوگوں کو آگاہ کر دیتا ہے۔ بالجبر ہدایت کی راہ پر چلا دینا اس کی سنت کے خلاف ہے۔

'ہِیَ' کا مرجع عام مفسرین نے 'سقر' کو سمجھا ہے لیکن میرے نزدیک اس کا مرجع وہ آیات منذرات ہیں جن میں 'سقر' کے احوال سنائے گئے ہیں۔ اس لیے کہ 'ذِکْرٰی' یعنی یاددہانی ہونے کی حیثیت درحقیقت ان آیات ہی کو حاصل ہے نہ کہ 'سقر' کو

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾

ہرگز نہیں، شاہد ہے چاند۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

آفاق کی بعض نشانیوں کا حوالہ: یہ آفاق کی چند نشانیوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس قیامت اور دوزخ سے لوگوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے وہ اس کائنات کے عظیم حوادث میں سے ہے اور اس کا ظہور قطعی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں تدریج و ترتیب ہے۔ جب اس کا وقت آجائے گا تو وہ ظاہر ہو جائے گی۔ اپنے وقت سے پہلے نہیں ظاہر ہو گی۔ اس کے ظہور میں تاخیر سے نہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ ظاہر ہو گی ہی نہیں حماقت ہے۔ رات میں اگر کوئی صبح کے لیے جلدی کرے تو اس کی جلد بازی کے سبب سے صبح اپنے وقت سے پہلے نہیں آئے گی۔ یہی حال قیامت کا ہے۔ اس کا بھی ایک وقت مقرر ہے۔ ٹھیک اسی وقت پر ظاہر ہو گی۔

'کَلَّا وَالْقَمَرِ'۔ آفاق کی نشانیوں میں سے پہلے چاند کی قسم کھائی ہے اور اس سے پہلے 'کَلَّا' کے ذریعے سے مخاطب کے زعم باطل کی پوری شدت سے تردید فرمادی ہے۔ قسم سے پہلے حرف نفی کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ اس طرح کے مواقع میں متکلم گویا مخاطب کے خیال کی تردید میں اتنا توقف بھی نہیں کرنا چاہتا کہ دلیل بیان کرنے کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ شدت نفرت کے اظہار کے لیے اس کی تردید ہی سے کلام کا آغاز کرتا ہے اور پھر بقید قسم اپنی دلیل بیان کرتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ اور اس نوع کی تمام قسمیں، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آرہے ہیں، بطور شہادت یا بالفاظ دیگر اس دعوے کی دلیل کے طور پر کھائی گئی ہیں جو ان کے بعد مذکور ہوا ہے۔ یہاں مخاطب، جیسا کہ موقع و محل سے واضح ہے، مکذبین قیامت ہیں اور ان کا جو شبہ زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ قیامت آنی ہے تو آکیوں نہیں جاتی۔ ان کے سامنے چاند کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے کہ جس طرح وہ درجہ بدرجہ ہلال سے بدر کے مقام تک پہنچتا ہے اسی طرح تم بھی مختلف اطوار و مراحل سے گزرتے ہوئے بالآخر ایک دن اس مقام تک پہنچو گے جہاں پہنچنے کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے اور اپنے رب کے عدل کامل کے ظہور کا مشاہدہ کرو گے۔ جس طرح چاند کے سفر کے لیے منزلیں مقرر ہیں، 'وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ' (یٰسٓ 39:36) (اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں)۔ اسی طرح اس روز جزا و سزا کے لیے بھی منزلیں مقرر ہیں جن سے گزرے بغیر اس کا ظہور نہیں ہو گا۔ کائنات کے نظام میں ہر تغیر اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اسکیم کے مطابق آتا ہے۔ دوسروں کی طلب و تمنا اور ان کی عجلت یا تاخیر کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ دن آئے گا ضرور، اس کے آئے بغیر اس دنیا کی تخلیق کا مقصد پورا نہیں ہو گا لیکن یہ اسی وقت آئے گا جب اللہ تعالیٰ کی تقویم میں اس کا مقررہ وقت، منٹ اور سیکنڈ کے فرق کے بغیر پورا ہو جائے گا۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے چاند کے طلوع و غروب اور اس کے عروج و محاق سے دین کے مختلف حقائق پر استشہاد کیا ہے جن کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے اور آگے کی سورتوں میں بھی بعض اہم چیزیں آئیں گی جن کی ہم ان شاء اللہ وضاحت کریں

گے۔ یہاں اس کے تدریجی ارتقاء کا پہلو پیش نظر ہے اور مقصود قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی کے ظہور کے لیے ایک معین پروگرام ہے جس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو وہی جانتا ہے۔ جو چیز اس کے عدل کا بدیہی مقتضیٰ ہے اس کا ظہور تو لازماً ہو گا لیکن ہو گا اپنے وقت پر۔ سورۂ انشقاق میں بھی چاند کی قسم وارد ہوئی ہے اور ہمارے نزدیک وہاں بھی اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا ہے:

وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ o لَتَرْكَبُنَّ طَبَقاً عَن طَبَقٍ (انشقاق 19-18:84)

"شاہد ہے چاند جب کہ وہ کامل ہوتا ہے کہ تم بھی درجہ بدرجہ بڑھو گے۔"

یعنی خدا کے مقرر کردہ روز جزاء و سزا کے لیے تمہاری حاضری تو لازمی ہے لیکن جس طرح چاند درجہ بدرجہ اپنے آخری نقطہ پر پہنچتا ہے اسی طرح یہ دن بھی اپنے مراحل طے کر کے ظہور میں آئے گا۔

وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿٣٣﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿٣٤﴾

اور رات جبکہ وہ پیٹھ پھیر لیتی ہے۔ اور صبح جب روشن ہو جائے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت:

'وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ'۔ چاند کے بعد یہ رات کی قسم کھائی ہے جب کہ وہ پیچھے مڑتی ہے اور صبح کی قسم کھائی ہے جب کہ وہ ہویدا ہوتی ہے، یعنی جس طرح رات کی تاریکی میں صبح کا کوئی نام و نشان نہیں ہوتا لیکن وقت آتا ہے کہ صبح نمودار ہو جاتی ہے وہی حال قیامت کے ظہور کا بھی ہو گا۔ یہ دنیا رات کے مانند ہے جس کی تاریکی صبح قیامت کو ڈھانکے ہوئے ہے لیکن وقت آئے گا کہ یہ تاریکی کافور ہو گی اور قیامت اچانک نمودار ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ جو ہر روز رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی دکھاتا ہے اور کسی کو بھی اس کائنات کے اس عظیم انقلاب پر تعجب نہیں ہوتا وہ جب چاہے گا قیامت کو بھی اسی طرح نمودار کر دے گا اور اس وقت سب دیکھ لیں گے کہ جس چیز کو وہ ناممکن سمجھتے تھے وہ سامنے آ گئی۔

بالکل یہی قسم، معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ، انذار قیامت کی تائید ہی کے مقصد سے سورۂ تکویر میں یوں آئی ہے:

وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ۝ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ (التکویر 18-17:81)

"شاہد ہے رات جب کہ جانے لگتی ہے اور شاہد ہے صبح جب کہ وہ سانس لیتی ہے۔"

اس کائنات کے ہر گوشے میں قیامت کی دلیل موجود ہے: اس تفسیر میں جگہ جگہ ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنائی ہے کہ اس کے ہر گوشے میں کسی نہ کسی شکل میں قیامت کا ریہرسل برابر ہوتا رہتا ہے تاکہ انسان کو اس کے باب میں جو شبہ بھی لاحق ہو اس کو دور کرنے کے لیے اسے اپنے گرد و پیش ہی سے کوئی ایسی مثال مل جائے جو اس کے دل کو مطمئن کر دے بشرطیکہ اس کے اندر سلامت روی اور حق کی طلب ہو۔

إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ﴿٣٦﴾

کہ یہ ماجرا ان بڑے ماجروں میں سے ہے۔ جو انسان کی تنبیہ کے لیے سنایا گیا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

یہ مذکورہ بالا قسموں کا مقسم علیہ ہے۔ یعنی قرآن کی یہ آیات جو دوزخ کے ہول سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لیے نازل کی گئی ہیں، ہنسی مذاق کی چیز نہیں ہیں بلکہ اس کائنات کے عظیم احوال و حوادث میں سے ہیں۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو ان سے سبق حاصل کرنے کے بجائے ان کو اپنے مذاق کا موضوع بنائیں۔

لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ﴿٣٧﴾

ان کے لیے جو تم میں سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا چاہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

دلیلوں سے فائدہ اٹھانا لوگوں کا اپنا کام ہے: یعنی اس ہولناک دن سے سابقہ پیش آنے سے پہلے لوگوں کو اس سے آگاہ کرنا ضروری تھا تاکہ جب یہ آئے تو کوئی یہ عذر نہ کر سکے کہ اس کو اس سے آگاہ نہین کیا گیا ورنہ وہ اس کے لیے تیاری کرتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ذریعہ سے اتمام حجت کر دیا۔ رہا اس کو رویا قبول کرنا تو یہ لوگوں کا اپنا کام ہے۔ جو اپنی عاقبت کی خیر چاہے گا وہ اس کو قبول کرنے کے لیے آگے بڑھے گا اور جس کی شامت آئی ہوئی ہو گی وہ اعراض و استکبار کی روش اختیار کرے گا اور پیچھے ہٹ جائے گا۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿٣٨﴾

ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہوگا۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

عمل ہی نجات دے گا، عمل ہی ہلاکت کرے گا: یعنی قانون الٰہی یہ ہے کہ جس طرح معلول اپنی علت کے ساتھ بندھا ہوا ہوتا ہے اسی طرح ہر شخص اپنے اعمال کے ساتھ بندھا ہوا ہوگا۔ جزاو سزا کے دن اس کا عمل ہی اس کو چھڑائے گا اور عمل ہی اس کو ہلاک کرے گا۔ اگر کوئی حسب و نسب اور شرک و شفاعت کے بل پر اس دن کی آفتوں سے چھوٹنے کے زعم میں مبتلا ہے تو وہ یاد رکھے کہ اس طرح کی کوئی چیز اس کے کام آنے والی نہیں ہے۔

إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ﴿٣٩﴾ فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٤٠﴾ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ﴿٤١﴾

صرف دہنے والے اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ وہ باغوں میں ہوں گے، پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے۔ مجرموں کے باب میں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

اصحاب الیمین: اس دن نجات و فلاح صرف اصحاب الیمین کو حاصل ہوگی۔ اصحاب الیمین کی تفصیل اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کو پیش نظر رکھ کر زندگی گزاری اور جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ فرمایا کہ یہ لوگ بے شک نہ صرف اپنی نیکیوں کا پورا پورا صلہ پائیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے بھی ان کو نوازے گا۔ یہ لوگ بہشت کے باغوں میں ہوں گے اور وہاں آپس میں ان مجرموں کے انجام سے متعلق سوال و جواب کر رہے ہوں گے جن سے دنیا میں ان کو سابقہ رہا۔

اس سوال وجواب کی نوعیت سورۂ صافات کی مدرجہ ذیل آیات سے واضح ہوتی ہے اور اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپس میں سوال و جواب کرتے کرتے کس طرح وہ دوزخ میں پڑے ہوئے مجرمین کو بھی مخاطب کرنے اور ان کے دوزخ میں پڑنے کا سبب معلوم کرنے کا موقع نکال لیں گے۔ فرمایا ہے:

فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءلُونَ ۝ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۝ يَقُولُ أَءِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِينَ ۝ أَءِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَاباً وَعِظَاماً أَءِنَّا لَمَدِينُونَ ۝ قَالَ هَلْ أَنتُم مُّطَّلِعُونَ ۝ فَاطَّلَعَ فَرَآهُ فِي سَوَاء الْجَحِيمِ (الصافات 37:50-55)

”پس اہل جنت ایک دوسرے کی طرف سوال و جواب کرتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا، دنیا میں میرا ایک ساتھی تھا جو کہا کرتا تھا کہ کیا تم بھی قیامت کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو! بھلا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا جزا اور سزا کے لیے اٹھائے جائیں گے! کہیں گے، بھلا جھانک کر دیکھو تو سہی! تو وہ جھانک کر دیکھے گا تو اس مجرم کو دوزخ کے بیچ میں دیکھے گا۔“

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ﴿٤٢﴾

سوال کریں گے، تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

یعنی اہل جنت آپس میں مجرموں سے متعلق سوال و جواب کرتے کرتے اہل دوزخ کو مخاطب کر کے ان سے بھی پوچھ لیں گے کہ بتاؤ تمہیں دوزخ میں کیا چیز لے گئی!

قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ﴿٤٤﴾ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٤٦﴾ حَتَّى أَتَانَا الْيَقِينُ ﴿٤٧﴾

وہ جواب دیں گے، ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ اور نہ غریبوں کو کھلاتے ہی تھے۔ اور (کٹ حجتیاں کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی) کٹ حجتیاں کرتے تھے۔ اور جزا و سزا کے دن کو جھٹلاتے رہے۔ یہاں تک کہ یقین کی ساعت آ گئی۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

اہل دوزخ کا اعتراف: اہل دوزخ ان کے جواب میں اعتراف کر لیں گے کہ ہمارے اعمال ہی ہمیں یہاں لانے والے بنے ہیں۔ قصور سارا ہمارا اپنا ہی ہے، کسی دوسرے کا نہیں ہے۔

سب سے پہلے وہ اس جرم کا اعتراف کریں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دین کے عقائد میں جس طرح توحید کو سب پر تقدم حاصل ہے اسی طرح اعمال میں نماز کو سب پر تقدم حاصل ہے۔ ہر نبی نے سب سے پہلے اسی عمل کی دعوت دی ہے اور اسی کے اہتمام اور اسی کے ترک پر دین کو منحصر بتایا ہے۔

اس کے بعد وہ اپنے عدم انفاق کا اعتراف کریں گے کہ وہ مسکینوں کو کھلانے کے روادار نہ تھے۔ اعمال میں نماز کے بعد دوسرا درجہ انفاق کا ہے اور انہی دونوں پر تمام اعمال صالحہ کی عمارت قائم ہے۔ ہم جگہ جگہ اس حقیقت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ نماز بندے کا تعلق خالق سے استوار کرتی ہے اور زکوٰۃ (انفاق) اس کو خلق سے جوڑتی ہے اور انہی دو کی استواری ہی پر آدمی کے دین کی استواری کا انحصار ہے۔

اس کے بعد وہ اس امر کا اعتراف کریں گے کہ قیامت اور جزا و سزا کے باب میں جس طرح کی نکتہ چینیاں اور موشگافیاں دوسرے کرتے تھے اسی طرح کی موشگافیاں کرنے والوں میں وہ بھی رہے ہیں اور انہی موشگافیوں کی آڑ لے کر انھوں نے جزا و سزا کے دن کو جھٹلایا یہاں تک کہ موت آگئی اور اس نے ان تمام چیزوں کا یقین دلا دیا جن کے بارے میں وہ شکوک پیدا کرتے رہے تھے۔

'کُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِینَ' سے اشارہ اس طرح کی باتوں کی طرف ہے جس کی ایک مثال دوزخ پر مامور فرشتوں کی تعداد کے بارے میں اوپر گزر چکی ہے۔

'**خوض فی الحدیث**' کے معنی ہیں کسی بات میں مین میکھ نکالتے نکالتے کہیں سے کہیں جان نکلنا اور اس کی فتنہ اور حق سے انحراف کے لیے بہانہ بنالینا۔

'حَتّٰٓی اَتٰىنَا الْیَقِیْنُ'۔ یقین کے اصل معنی تو یقین ہی کے ہیں لیکن چونکہ موت کے بعد تمام مابعد الموت حقائق آدمی پر روشن ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے یقین پر مجبور ہو جاتا ہے اس وجہ سے موت کو بھی یقین سے تعبیر کرتے ہیں جس طرح ایک شے کے لازم سے خود اس شے کو تعبیر کر دیتے ہیں۔

یہاں مجرموں کے جو اعترافات نقل ہوئے ہیں وہ اس حقیقت کے اثبات کے لیے نقل ہوئے ہیں جو اوپر 'كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے تاکہ جو نادان اپنے خاندان اپنے حسب و نسب اور اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر جزاو سزا کا مذاق اڑا رہے تھے ان کے کان اور ان کی آنکھیں کھلیں اور ان پر یہ حقیقت خود ان کے ہم مشربوں کی زبان سے واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک اعمال کے سوا کوئی چیز کام آنے والی نہیں ہے۔

فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴿٤٨﴾

تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ نفع نہ دے گی۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

مشرکین کی مزعومہ شفاعت کی نفی: یہ ان کے مزعومہ شفعاء اور ان کی مفروضہ شفاعت کی نفی فرمائی ہے کہ نہ وہاں ان کے مزعومہ شفعاء ہوں گے اور نہ ان کی شفاعت۔

یہاں کلام، عربیت کے اسلوب پر ہے جس کو '**نفی الشئ ینفی لازمہٖ**' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جو کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔ امراء القیس نے ایک صحرائی راستہ کی تعریف میں کہا ہے کہ 'لایُھتدٰی بمنارہٖ' اس کے منارہ سے رہنمائی نہیں حاصل کی جاتی۔ اس کا مطلب ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس میں منارے ہیں ہی نہیں کہ ان سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ مشرکین کو اپنے جن شفعاء پر ناز تھا ان کے متعلق قرآن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ 'إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ' (النجم 23:53) (یہ تو محض فرضی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں، ان کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں)۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿٤٩﴾

ان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ یاددہانی سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں!

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

اعراض کرنے والوں کے حال پر تعجب: یہ ان کے حال پر تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ ان کو تو اپنے رب کا شکر گزار ہونا تھا کہ اس نے جزا و سزا کے یوم موعود سے پہلے ان کی یاددہانی اور اصل حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے ایک کتاب بھی نازل کر دی اور ایک رسول بھی بھیج دیا لیکن ان کا حال عجیب ہے کہ وہ اس یاددہانی سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔

'مُعْرِضِيْنَ' ضمیر مجرور سے حال پڑا ہوا ہے۔ یہ اسلوب عربیت میں معروف ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾

گویا کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہوں۔ جو شیر سے ڈر کے بھاگے ہوں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

یہ ان کی وحشت زدگی کی مثال ہے۔ فرمایا کہ ان کا حال ان بدکے ہوئے گدھوں کا ہے جو شیر سے ڈر کے بھاگے ہوں۔ قَسْوَرَةٌ شیر کو کہتے ہیں۔ گدھے اور گورخر وغیرہ شیر کی آواز سن کر بھاگے ہوں تو وہ بڑی مشکل سے قرار پکڑتے ہیں۔ کسی طرف سے ذرا بھی کھٹکا ہو تو وہ اس طرح بھاگتے ہیں گویا شیر ہی آ گیا۔ فرمایا کہ یہی حال ان لوگوں کا ہے۔ یہ اس یاددہانی سے ایسے سہمے ہوئے ہیں کہ اس کا ایک حرف بھی سننے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ایک حقیقت جب اتنی واضح ہو کہ آدمی کا دل اس کے انکار پر بھی مطمئن نہ ہو اور اس کو قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہو تو اس سے اس کے گریز و فرار کی شکل یہی ہوتی ہے جو اس مثال میں واضح فرمائی گئی ہے۔ اس کی خواہش اور کوشش ہر وقت رہتی ہے کہ کسی طرف سے اس کے کانوں میں کوئی ایسی آواز نہ پڑنے پائے جو اس حقیقت کو یاد دلا دے۔

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾

بلکہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اس کو کھلے ہوئے صحیفے پکڑا دیے جائیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

اعراض کا بہانہ: یعنی اس یاددہانی سے فرار کے لیے انھوں نے یہ بہانہ بنایا ہے کہ اگر خدا کو کوئی کتاب ہی اتارنی تھی تو انہی (محمد ﷺ) پر یہ کیوں اتاری گئی! ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہمیں بھی کھلے ہوئے صحیفے پکڑا دیے جاتے! آخر اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا کرنا کیا دشوار تھا! یہ وہی بات ہے جو دوسرے مقام میں یوں بیان ہوئی ہے:

وَإِذَا جَاءتْهُمْ آيَةٌ قَالُواْ لَن نُّؤْمِنَ حَتَّى نُؤْتَى مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللّهِ اللّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ (الانعام 6:124)

"اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر اس وقت تک ایمان نہیں لانے کے جب تک کہ ہمیں بھی اسی طرح نہ ملے جس طرح اللہ کے رسولوں کو ملی۔۔۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت سے کن کو سرفراز کرے!"

كَلَّا ۖ بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ﴿٥٣﴾

ہرگز نہیں، بلکہ وہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

اصل حقیقت: یعنی نہ ایسا ہونا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ ان کے گریز کی علت یہ نہیں ہے جو یہ ظاہر کر رہے ہیں بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ آخرت کے وقوع کے متوقع نہیں ہیں۔ 'يَخَافُوْنَ' یہاں 'يَرْجُوْنَ' کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ اس کے شواہد اس کے محل میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ آخرت سے نچنت ہیں اور ان کی دلی خواہش یہی ہے کہ اس سے نچنت ہی رہیں، اس کی فکر ان کے عیش کو مکدر کرنے نہ پائے تو ان کو کوئی نشانی بھی قائل نہیں کر سکتی۔ ان کی طلب کے مطابق ان کے کھلے صحیفے بھی پکڑا دیے جائیں جب بھی وہ کوئی نہ کوئی بت بنا ہی لیں گے۔

كَلَّآ إِنَّهُۥ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُۥ ﴿٥٥﴾

ہر گز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ تو جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

نبی صلعم کے لیے تسلی: یہ ان ہٹ دھرموں سے اظہار بے نیازی اور نبی ﷺ کے لیے پیام تسلی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے ضدیوں کی زیادہ نازبرداری کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک یاددہانی ہے جو انھیں کر دی گئی۔ جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے اور سیدھی راہ اختیار کرے۔ اگر وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے، نہ اللہ کا کچھ بگاڑیں گے نہ رسول کا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ پکڑنے سے پہلے لوگوں کو یاددہانی کر دیتا ہے تاکہ اس کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور رسول کا فرض یہ ہے کہ وہ اس یاددہانی کو لوگوں تک پہنچا دے۔ لوگوں کے دلوں میں ہدایت اتار دینا نہ رسول کی ذمہ داری ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ ان لوگوں کے دلوں میں اپنی ہدایت اتارے جو اس سے بیزار ہیں۔

وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ ٱلتَّقْوَىٰ وَأَهْلُ ٱلْمَغْفِرَةِ ﴿٥٦﴾

اور وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔۔۔ وہی اہل تقویٰ اور وہی سزاوار مغفرت ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی وضاحت:

ہدایت کے باب میں سنت الٰہی: یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اس نے پسند فرمائی ہے اور جو اس کتاب میں جگہ جگہ زیر بحث آ چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی کو بخشتا ہے جو اپنے سمع و بصر اور فواد کی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں، جو فطرت کے نور کی قدر کرتے ہیں، جو آفاق و انفس کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں اور ہر اس بات کو سننے اور سمجھنے کے لیے اپنے کان کھلے رکھتے ہیں جو معقول ہو اگرچہ وہ ان کے نفس کی خواہشوں کے کتنے ہی خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ہر مشیت اس کی حکمت کے تحت ہے۔ وہ انہی کو ہدایت بخشتا ہے جو ہدایت کی قدر کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو اس کی قدر نہیں کرتے ان کو ہدایت دینا تو درکنار اللہ تعالیٰ ان کی وہ صلاحیت بھی سلب کر لیتا ہے جو فطرت کی راہ سے ان کو حاصل ہوئی ہوتی ہے۔ اس باب میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ارشاد کا حوالہ ہم جگہ جگہ دے چکے ہیں۔

'هُوَ اَهۡلُ التَّقۡوٰی وَاَهۡلُ الۡمَغۡفِرَةِ'۔ مفسرین نے عام طور پر 'ھُوَ' کا مرجع 'اللّٰہ' کو قرار دیا ہے اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ ہی تقویٰ کا سزاوار ہے اور مغفرت کا اہل ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا تعلق 'فَمَنۡ شَآءَ ذَكَرَهٗ' سے ہے۔ 'مَنۡ' واحد، جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے ضمیریں دونوں قسم کی استعمال ہو سکتی ہیں۔ یہ بتایا گیا ہے کہ کون اس قرآن سے یاددہانی حاصل کرے گا اور اس کے صلہ میں اللہ کی مغفرت کا سزاوار ٹھہرے گا اور کون اس سے محروم رہیں گے۔ فرمایا کہ جن کے اندر خدا کا خوف ہو گا وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور وہ مغفرت کے اہل ٹھہریں گے۔ رہے وہ جن کے سینے خوف خدا سے خالی ہیں وہ اس سے محروم ہی رہیں گے اور جب وہ اس سے محروم رہیں گے تو خدا کی مغفرت سے بھی محروم رہیں گے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں 'هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ' کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کا فیض کن لوگوں کو پہنچتا ہے اور کون لوگ اس سے محروم رہتے ہیں۔ اس سنت الٰہی کی تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔ تقویٰ کے مختلف مدارج ہیں۔ انسان کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو تقویٰ ودیعت فرمایا ہے اور جس کا ذکر 'فَأَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰهَا' (الشمس 8:91) میں ہے، یہاں اسی تقویٰ کی طرف اشارہ ہے۔ آگے والی سورہ میں ان شاء اللہ اس فطری تقویٰ کی پوری وضاحت آپ کے سامنے آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وہ غلطیوں سے درگزر فرمائے اور اس کی صحیح باتوں کے لیے دل میں جگہ پیدا کرے۔ واللہ ھوالموفق للصواب۔

رحمان آباد

۱۸ دسمبر ۱۹۷۸ء

۱۷ محرم الحرام ۱۳۹۸ھ

Our other pages and blogs:

www.facebook.com/Dr.Muhammad.Hamidullah

www.facebook.com/Payam.e.Iqbal

www.ebooksland.blogspot.com

www. facebook.com/ye.Meri.dunyaa

پیام قرآن

The Message of Quran

www.facebook.com/payamequran